



ناولٹ

باہر جھانکنے لگیں۔
گاڑی نہر کے بل پر سے گزر رہی تھی۔ کناروں پر
ایستا وہ بلند دیوالا شیشم کے درختوں پر دھیرے دھیرے
خزاں کا موسم سرایت کر رہا تھا۔ ان کے زرد غمے
ٹوٹ ٹوٹ کر نہر کے پانیوں پر گرتے اور ہلکورے لیتے
تھے۔ بوڑھا ٹیکر کا درخت اب بھی ہمیشہ کی طرح جھک
کر نہر کے بڑے حصے کو اپنی شاخوں میں گھیرے سرخ
گدلے نہر کے پانیوں سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس
کی بوڑھی شاخوں میں اب بھی چڑیوں کے گھونسلے
جھانک رہے تھے۔
یہ موسم سرما کا آغاز تھا۔

اوائٹل سرما کی خنک خزاں زہج کا سورج سرخ
تھال کی طرح جلی وی بو شہر کے عقب سے بلند ہو رہا تھا۔
انہوں نے گاڑی کا شیشہ ہٹا دیا۔ ہانیہ نے ذرا
حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر سے باہر نظریں
جمادیں۔ اوس میں بھیگی خنک ہوا کے جھونکے ایک دم
بڑھ کر انہیں اپنے دھار میں لینے لگے۔
اک کچی سی ان کے وجود پر چھا گئی۔

براؤن کشمیری شال اپنے شانوں پر پھیلاتے ہوئے
انہوں نے گردن گھما کر ہانیہ کو دیکھا وہ دونوں ہاتھ گود
میں دھرے کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔
”ہانیہ۔“ انہوں نے دھیرے سے پکارا۔

وہ سنی آن سنی کر گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور
سوئی ہوئی سی تھیں۔ چہرے پر خفگی کے ساتھ ساتھ
جھٹکن کے اثرات بھی نمایاں ہو گئے تھے۔

تو ثابت ہو گیا کہ یہ اک سفر لا حاصل تھا۔
انہوں نے اک طویل سانس لے کر سرد ہوا کی
خنکی کو اپنے اندر جذب کیا۔
اور اب پھر سے سفر لا حاصل درپیش ہے اور کھیل
میں کیا کھویا کیا پایا کا سوال انہوں میں اپنا خالی دامن کس
کو دکھاؤں گی۔
گاڑی کے سامنے اسپڈ بریکر آگیا تھا۔ ایک جھٹکے
نے انہیں سوجھ بوجھ کے گرداب سے کھینچ نکالا۔
انہوں نے گاڑی سے اتر کر کھینچنی اور گاڑی سے



عجبت سے کہا اور پھر سے کھڑکی کا شیشہ - چڑھا دیا۔
”نھیک ہوں میں۔“ وہ نظروں کا زاویہ بدلے بغیر بولی تھی۔

”تم جانتی ہونا وہاں کون کون رہتا ہے۔“ ان کا دل باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا یا شاید وہ گھر چھپنے سے پہلے ہانیہ کا موڈ ٹھیک کرنا چاہتی تھیں۔

”وہاں۔“
”مجھے کچھ نہیں پتا ماما! آپ مجھے اس سے قبل بھی نہیں لائیں۔“ وہ سیٹ سے لہجے میں ان کی بات کاٹ گئی۔ عالیہ ایک بل کو خاموش رہ گئیں۔
”تمہارے بابا نہیں چاہتے تھے کہ تم ان سب سے ملو۔“ انہوں نے اس کی سسکی سے بتایا تو ہانیہ نے گردن موڑ کر بے حد حیرت سے اس کی دیکھ لی۔
”بابا نہیں چاہتے تھے؟“ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”وہاں تمہاری نانہ ہوں گی۔ جنہیں سبیلی بی جان کہتے ہیں تمہارے ماموں منظور غوث شمالی شاہوہان کے بیٹے۔“

”ماما وہاں جا رہے ہیں تو مل لوں گی۔“ عالیہ اس کی حیرت اس کا سوال یکسر نظر انداز کر گئی تھیں۔ ہانیہ کو اچھا نہیں لگا تو بات کاٹ کر رکھائی سے بولی تھی۔
عالیہ ایک بل کو خاموش ہو گئیں۔ گاڑی شرکی حدود سے باہر نکل آئی تھی۔ اکاؤ کا گھر حیرت اور باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

”یہ پیٹرول پمپ بھی تمہارے ماموں کا ہے۔“
ہانیہ نے نظر اٹھا کر ذرا کی ذرا پیٹرول پمپ کی سرخ عمارت کو دیکھا اور سامنے نظریں جمادیں۔ کوئٹہ کی سیاہ اوس میں بھگی سڑک اونچے اونچے درختوں میں گھری تھی۔ اسے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا تھا وہ پوچھنے بغیر نہ رہ سکی۔

”کیا انکل منظور گاؤں میں رہتے ہیں۔“
”گاؤں اور شہر کے سنگم پر ویسے تم انہیں ماموں کوگی تو انہیں اچھا لگے گا۔“ عالیہ نے مسکرا کر اسے

دیکھا ہانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”ان کا اپنا فارم ہاؤس ہے۔“ سگترے کے باغات ہیں۔ ایک چھوٹی سی فوڈ فیکٹری ہے۔ نیاز فوڈ فیکٹری۔ وہاں جو سزاور جیم وغیرہ بنتے ہیں۔“

ہانیہ احمد نے یہ تفصیل قدرے حیرت سے سنی تھی۔ سامنے اسے کبھی یہ سب نہیں بتایا تھا۔
”فارم ہاؤس میں کھڑے بھی ہیں۔“ اس نے ایک دم پوچھا، لہجے میں ہلکا سا اشتیاق در آیا تھا۔ یہ سب اسے ایک دم سے بڑا روٹینٹ سا لگا۔ عالیہ مسکرا دیں۔

”نہیں بابا کے زمانے میں تو تھے بعد میں کسی کو شوق ہی نہیں رہا۔ یہ بھی بہت ہے کہ یہ فارم ہاؤس اور باغات بچ رہے۔ رامش آری میں چلا گیا۔ دانش ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکا چلے گئے۔ یہاں تو بس شیراز ہوتا ہے۔“

”لیکن یہ ضروری تو نہ تھا کہ ہم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آتے۔“ اسے از سر نو یاد آیا۔
”یہ ضروری تھا۔“ ان کا لہجہ بیگانہ اور سیٹ ہو گیا۔
”آپ بابا کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھیں؟“ مگر وہ گھر کا کار تھا۔ آپ دو سال سے بابا سے الگ اس گھر میں رہ رہی تھیں تو۔“

”ہانیہ احمد! انہوں نے بہت سختی سے پکارا تھا۔ ہانیہ نے لب بھجھ لے۔ وہ بہت غصے میں ہوتیں تو اسے ہمیشہ پورے نام سے پکارنا اور اس بل جو اجنبیت اور نفی ان کے لہجے میں در آتی تھی اس کی تلخی سننے ہی سے وہ محسوس کرتی تھی۔ ”میں اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔“

ہانیہ احمد سر جھٹک کر رہ گئی۔
”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ماما! آپ کو مجھ سے ذرا محبت نہیں رہی۔“ اس کی نگاہیں ابھرتے سورج کی نوخیز کرنوں سے ابھری گئیں۔

”تم مجھے یہ احساس دلاؤ کہ میں نے تمہیں اپنے ساتھ لاکر لفظ کی ہے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے

خول میں بند ہو گئی تھیں۔ اس کی بات گویا سنی ہی نہیں۔
”آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لانا چاہتی تھیں۔“ وہ بدگمان ہو گئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ شاید تم اپنے بابا کے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔ میں نے تمہیں مجبور نہیں کیا تھا۔“

”تو آپ مجھے واقعی نہیں لانا چاہتی تھیں۔“ ہانیہ نے اک طویل سانس لے کر انہیں دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتیں، خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا

بدر ہوا تھا۔
”اب کس طرف جانا ہے؟“
”سڑک اب تین حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔“
”دائیں طرف مڑ جاؤ۔“

گاڑی نے دائیں طرف رخ موڑا۔ اور اس کے ساتھ ہی دور تک پھیلے سگترے کے باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فضا میں سگتروں کی کھنسی۔ مچھی منک شامل تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز باغات پر نوخیز سج دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ بالٹوں کے درخت لدے ہوئے تھے۔ اور سڑک کے آغاز پر ہی ”نیاز فارم ہاؤس“ اور ”نیاز فوڈ فیکٹری“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اور جلد ہی اس کی نگاہوں کی گرفت میں آئے۔

تھا شاہ درختوں میں گھرا، بڑے بڑے قدیم درختوں اور والائوں والا سفید گھر آگیا ہے۔ جس کی بیرونی دیواروں پر سفید قلعی اتری لڑکی تھی۔ بڑا سا لکڑی کا جھولتا ہوا پھاٹک کھلا ہوا تھا، سرخ اینٹوں کی بنی روش کے گرد سفیدے کے درخت اور ہار سنگھار کے پیرٹنڈ منڈ حالت میں کھڑے تھے۔ وسیع و عریض باغیچے میں بھی بے تحاشا آم، امرود، جامن اور کیلے کے درخت نظر آرہے تھے۔ گاڑی پھسلتی ہوئی گول ستونوں والے پر آمدے کے ساتھ متصل پورج میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

”آجاؤ ہانیہ! گھر آگیا ہے۔“ عالیہ کے لہجے میں ہلکی سی خوشی کی رمتن جاگی تھی۔ ہانیہ گاڑی سے نیچے اتر

آئی۔ اس نے ایک نظر پھر سے پلٹ کر باغیچے پر ڈالی اس نے ہمیشہ اک جدید ویل ڈیکورٹڈ گھر اور ایک بچے جائے لان میں زندگی گزار رہی تھی۔ مگر اس گھر کے پر آمدوں، دروازوں اور درختوں میں قدامت جھلکتی تھی۔ اور اس کے باغیچے میں اک خوبصورت بے ترتیبی نظر آتی تھی۔
”یہاں کے لوگ ماضی پرست ذہن کے مالک لگتے ہیں۔“

یہ سلا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ماما جالی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھیں۔ ہانیہ نے بھی ان کی تقلید کی۔

”افوہ ثریا! تم اتنی ست ہو کہ کیا بتاؤں تمہاری جگہ میں دس کمرے صاف کرتی۔“ جینجیلائی ہوئی مترنم آواز ابھری تھی۔
”تو بی بی! آپ یہ کر لیں، وہ دس کمرے میں صاف کرتی ہوں۔“ ثریا نے ہنستے ہوئے کہا۔

”باتیں بنو الو تم سے، جاؤ ماما کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹاؤ، ابھی وہ شہزادہ عالم اٹھ گئے تو دو ڈیس لگوادیں گے۔“

ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ سبز لباس میں ملبوس وہ نازک سی لڑکی کہتے کہتے پلٹی۔ پھر تھٹھک کر رک گئی۔

”عالیہ پھپھو۔!“ دوسرے بل وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

”پھپھو کی جان! کیسی ہو؟“
”ایکدم فرسٹ کلاس، مگر پھپھو آپ اتنی اچانک اور وہ بھی بغیر اطلاع کے۔“

ہانیہ قدرے حیرت سے اس لڑکی کا جوش دیکھ رہی تھی تب ہی اس کی نگاہ ہانیہ پر پڑی۔
”ارے یہ ہانیہ ہے نا۔“

”ہاں اور ہانیہ، یہ تمہاری کزن سیمل ہے۔“ عالیہ نے تعارف کروایا۔

”یہ بہت اچھا کیا پھپھو! آپ ہانیہ کو لے آئیں۔“
”ج میں بہت بور ہوئی تھی گھر میں۔ کیوں ہانیہ! دوستی

رہے گی تا کہ کس بے تکلفی اور گرجوٹی سے اس نے ہانیہ کہا تھ تھا تھا تھا۔

”اوشیور۔“ ہانیہ احمد کو وہ سانہ پر خلوص سی لڑکی اچھی لگی تھی۔ ثریا نے جا کر سب کو خبر کر دی تھی۔ آن واحد میں سب کے سب جمع ہو گئے، بی بی جان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ شاہدہ ممائی بچن سے ہاتھ میں چھری اور پیاز تھامے لپک کر آئی تھیں۔ ماموں شاید نمائے کے ارادے سے کندھے پر تولیہ رکھے گھوم رہے تھے۔ کس محبت سے انہوں نے عالیہ اور ہانیہ کو گلے لگا کر ہار کیا تھا۔

”ارے بھی شاہدہ! کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔“
”اب تو اسپتال ناشتہ بنے گا۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”نہیں شاہدہ! اہتمام کی ضرورت نہیں۔“ عالیہ نے روکا۔

”میں شیراز کی فرمائش پر آلو کی بجھیا اور پوریاں بنا رہی تھی۔“

”بس تو پھر ہو گیا نا اسپتال ناشتہ۔“ عالیہ مسکرائیں۔

”ہاں اور ساتھ میں سوچی اور پٹوں کا حلوہ بنا لو“ ایلٹ اور۔

”بس بی بی جان کافی ہے یہ سب۔“ اس کے پہلے کہ بی بی جان کچھ اور گنوانیں عالیہ نے روک دیا۔

سب کے سب عالیہ کے گرد جمع تھے ہانیہ کو ایک پل کے لیے اپنا آپ فالٹو سا گائب ہی کوئی آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔

”کہاں ہیں؟ کہاں ہیں؟ ہماری پیاری اور اکلوتی پیچھو جانی ہائیں۔“ وہ ایک جھٹکے سے روکا اور تحیر سے بولا۔

”یہ پیچھو کی شکل ثریا سے کیسے مل گئی؟“
”تو ہے شیراز بابو۔“ دروازے کے عین درمیان کھڑی ثریا سر پر ہاتھ مار کر ہار نکل گئی۔

”پیچھو۔“ وہ لپک کر قریب ہوا ”یا اللہ یہ میری نظروں کا دھوکا یا اللہ کی قدرت ہے۔“

”آپ شیراز چارلس کہہ لیں۔ اگرچہ کہاں وہ کہاں ہم۔“ خلی سے کہتے کہتے آخری جملہ وہ شوخی سے کہہ گیا تھا۔

”نہ پھو بھی سے خیریت پوچھی نہ کچھ اور“ آتے ہی

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر ہانیہ کو دکھا۔
”لاہور سے چچا وطنی آتے آتے یہ کیا جادو ہوا کہ پیچھو پھر سے یک ہو گئیں۔“ می ایک چکر بی بی جان کو بھی لگوا دیں۔ ایک دم یک ہو جائیں گی، سچ مجھے بڑا شوق ہے بی بی جان کو عالم جوانی میں دیکھنے کا۔“
”یہ لڑکا تو بالکل ہی پاگل ہے۔“ بی بی جان نے اسے بری طرح گھورا۔

”ڈیڈی ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں پورے کا پورا آپ پر گیا ہوں۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

”مجھ پر نہیں اپنی ماں پر پڑے ہو۔“ بی بی جان نے چڑ کر کہا۔

”اسی لیے میں اتنا خوبصورت ہوں۔“ وہ خوش ہو گیا اور پھر ہانیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا اب میں آپ کو پیچھو کیسے کہوں گا۔“ کان کھجاتے ہوئے وہ کچھ پریشان نظر آیا۔

”احق لڑکے! میں یہاں ہوں۔“ عالیہ نے ہنستے ہوئے عقب سے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

”آپ پیچھو۔“ وہ پلٹا اور ان سے لپٹ گیا۔
”پیچھو! اس گھر میں صرف میں آپ کو سب سے زیادہ یاد کرتا ہوں۔“

”سفید جھوٹ۔“ سیمل فوراً بول اٹھی۔
”ان کی باتوں پر مت جائیے گا۔ یہ سب مجھ سے

جائے ہیں۔“
”ہاں! تم تو شہزادی ڈیانا ہونا۔“ بی بی جان چڑ کر بول اٹھی تھیں۔ سب کے لبوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ اتنی بے ساختہ تھی کہ وہ سر پٹ کر رہ گیا۔ بی بی جان نے ایک دفعہ ڈیانا کوئی وی پر دیکھ لیا تھا شیراز نے ہی اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔

”آپ شہزادہ چارلس کہہ لیں۔ اگرچہ کہاں وہ کہاں ہم۔“ خلی سے کہتے کہتے آخری جملہ وہ شوخی سے کہہ گیا تھا۔

”نہ پھو بھی سے خیریت پوچھی نہ کچھ اور“ آتے ہی

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر ہانیہ کو دکھا۔
”لاہور سے چچا وطنی آتے آتے یہ کیا جادو ہوا کہ پیچھو پھر سے یک ہو گئیں۔“ می ایک چکر بی بی جان کو بھی لگوا دیں۔ ایک دم یک ہو جائیں گی، سچ مجھے بڑا شوق ہے بی بی جان کو عالم جوانی میں دیکھنے کا۔“
”یہ لڑکا تو بالکل ہی پاگل ہے۔“ بی بی جان نے اسے بری طرح گھورا۔

”ڈیڈی ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں پورے کا پورا آپ پر گیا ہوں۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

”مجھ پر نہیں اپنی ماں پر پڑے ہو۔“ بی بی جان نے چڑ کر کہا۔

”اسی لیے میں اتنا خوبصورت ہوں۔“ وہ خوش ہو گیا اور پھر ہانیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا اب میں آپ کو پیچھو کیسے کہوں گا۔“ کان کھجاتے ہوئے وہ کچھ پریشان نظر آیا۔

پنی اونگی بوگی حرکتوں پر اتر آئے۔
”شاہدہ! پتا نہیں تمہارا یہ لڑکا کس پر پڑا ہے۔“ بی بی نے گھورا۔

”آپ پر۔“ وہ اطمینان سے کہہ کر عالیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”پیچھو! یہ روٹھی حینہ کہاں مل گئیں آپ کو؟“
اس کی شریر نگاہوں نے ہانیہ کو فوکس کیا۔ تب ہی منظور غوث صاحب نے کھنکار کر گویا اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”اف۔۔۔“ وہ جھٹ زبان دانتوں تلے دبا کر سیمل کی طرف پلٹا۔

”بتا نہیں سکتی تھیں آپ کی ڈیڈی یہیں ہیں۔“
”تم نے اپنی آنکھیں کسی کو ادھار دے رکھی ہیں کیا؟ اور میں ڈیڈی کے صبر کی انتہا دیکھ رہی تھی۔“ وہ مزے سے بولی۔

”شیراز! یہ ہانیہ ہے اور ہانیہ یہ شیراز اور تم اس کی کمپنی میں بالکل بول نہیں ہوگی۔“

عالیہ نے تعارف کرایا اور بی بی جان کے پاس جا بیٹھیں۔ وہ لوگ اپنی باتوں میں مگن ہو گئے۔ سیمل کو شاہدہ مامی نے اپنی ہڈ کے لیے پکار لیا۔ شیراز کچھ لمحے کھڑا ادھر ادھر دیکھا رہا، پھر اس کے پاس آ بیٹھا۔

”ہائے مس ہانیہ! میں شیراز ہوں اور بہت خوبصورت ہوں۔“ یہ گویا تمہید تھی ہانیہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے فوراً وضاحت کی۔

”دراصل یہاں سب لوگ بہت خوبصورت ہیں۔ اس لیے مجھے ہمیشہ بتانا پڑتا ہے کہ میں بھی ہوں، آپ اسے خود فریبی مت سمجھئے گا۔ میں ہمیشہ حقیقت بیان کرتا ہوں۔“

اس کے ہونٹوں پر شریر بچوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ کھڑی ناک، سپید رنگت، جاذبِ نظر نقوش اور چمکتی ہوئی ذہن آنکھیں۔ بلاشبہ وہ خوبصورت نوجوان تھا۔ ہانیہ مسکرا دی۔

”ہانیہ جی۔!“
”تم مجھے آپ کی کہہ سکتے ہو۔“ ہانیہ کو اس کا بات

اس کے ہونٹوں پر شریر بچوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ کھڑی ناک، سپید رنگت، جاذبِ نظر نقوش اور چمکتی ہوئی ذہن آنکھیں۔ بلاشبہ وہ خوبصورت نوجوان تھا۔ ہانیہ مسکرا دی۔

”ہانیہ جی۔!“
”تم مجھے آپ کی کہہ سکتے ہو۔“ ہانیہ کو اس کا بات

اس کے ہونٹوں پر شریر بچوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ کھڑی ناک، سپید رنگت، جاذبِ نظر نقوش اور چمکتی ہوئی ذہن آنکھیں۔ بلاشبہ وہ خوبصورت نوجوان تھا۔ ہانیہ مسکرا دی۔

”ہانیہ جی۔!“
”تم مجھے آپ کی کہہ سکتے ہو۔“ ہانیہ کو اس کا بات

اس کے ہونٹوں پر شریر بچوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ کھڑی ناک، سپید رنگت، جاذبِ نظر نقوش اور چمکتی ہوئی ذہن آنکھیں۔ بلاشبہ وہ خوبصورت نوجوان تھا۔ ہانیہ مسکرا دی۔

”ہانیہ جی۔!“
”تم مجھے آپ کی کہہ سکتے ہو۔“ ہانیہ کو اس کا بات

اس کے ہونٹوں پر شریر بچوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ کھڑی ناک، سپید رنگت، جاذبِ نظر نقوش اور چمکتی ہوئی ذہن آنکھیں۔ بلاشبہ وہ خوبصورت نوجوان تھا۔ ہانیہ مسکرا دی۔

کرنے کا بے ساختہ انداز اچھا لگا تھا اس کے خیال میں ایسے لوگ منافق نہیں ہوتے۔

"افسوس ایک اور آپلے اللہ میاں جی۔" اس نے سر اٹھا کر بڑی بے بسی سے اور دیکھا "کب میں بڑا ہوں گا آخر مجھے کب ان آپلوں کے چنگل سے نجات ملے گی۔ ایک بات تو بتائیں ہانیہ۔!" وہ ایک لمحے کو رکائی ہر لڑکی مجھے دیکھتے ہی بھائی کیوں ہنالتی ہے کیا میرے چہرے پر بھائی بن کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔"

وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے فکرت سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں بھئی ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ہانیہ مسکرا دی۔

"لیکن یہ پر اہم تو ہے نا اس طرح تو میں کنوارہ رہ جاؤں گا۔"

جس فکراور بے بسی سے شیراز نے کہا تھا ہانیہ بے ساختہ ہنس دی تھی۔ اس کی ہنسی کی آواز پر عالیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا اور قدرے مطمئن ہو گئیں۔

انہیں معلوم تھا شیراز کی باتیں ہانیہ کا ذہن بٹالیں گی۔ ہانیہ بھی سب کچھ بھول کر شیراز کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گئی تھی۔

"تم فکر نہ کرو تمہارے لیے ہم بہت اچھی سی لڑکی ڈھونڈیں گے۔"

"رنگی۔" شیراز اچھل پڑا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وعدہ کریں۔" اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔

"وعدہ بھئی۔"

"شیراز۔!" شاہدہ مامی نے آکر دیکھا تو جھنجھلا کر پکارا۔ "تم ابھی تک ہانیہ کے کان کھا رہے ہو۔؟"

"دونوں اپنی جگہ پر موجود ہیں۔" وہ کانوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ہانیہ کو سیمل کے کمرے میں لے جاؤ وہ فریض ہو لے تو پھر ناشتہ کرتے ہیں۔"

"آئیں آپ! آپ کو کمرہ دکھا دوں پھر مجھے ذرا ناشتہ کا جائزہ بھی لینا ہے۔"

شیراز نے کہا تو وہ اس کی معیت میں سیمل کے کمرے میں آگئی۔ شاہدہ مامی نے اس کا سوٹ کمر بھی سیمل کے کمرے میں ہی رکھوا دیا تھا۔

"اچھا رہے گا۔" وہ جوں یہاں آنے کے خیال سے ہی خائف تھی اب قدرے سہولت سے سوچ رہی تھی۔ "بہت فریک اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔" آئی تھنک میں یہاں سیٹ ہو جاؤں گی۔ ماما بھی کچھ خوش دکھائی دیتی ہیں۔ مگر میرے ساتھ ان کا رویہ بہت بدل سا گیا ہے۔ کبھی ایک دم مہیاں تو کبھی ایک دم اجنبی۔ حالانکہ میں نے کب چاہا تھا کہ پیاسی کنڈ میرا کریں۔ یا شاید ماما کے اسی رویے نے پایا کو ان سے کر دیا۔"

شاہدہ لیتے ہوئے بھی اس کی سوچیں پایا اور اس گھر کے کمپنوں کے درمیان کھومتی رہی تھیں۔

"خدا کا۔" آپ اتنی سردی میں نہالیں؟"

شیراز کی تحیر بھری آواز پر کیلے بالوں میں چلتی اس کی انگلیاں رک گئی، اس نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرائی۔

"اچھی سردی شروع کہاں ہوئی ہے۔"

"ایسا آپ کی کھال چمڑے کی ہے۔" شہزادہ دمیر کا ہاتھ ہونے والا ہے۔"

شیراز کی باتوں پر بالکل مت جانا اس کا ایک ہی اصول تھا۔ سردیوں کے شروع میں نہالو اس کے بعد باری گرمیوں کے آغاز میں آتی ہے۔ اس کے پیچھے ہی سیمل اندر داخل ہوئی تھی۔

"میں تو صابن پانی کا خرچہ بچاتا ہوں۔" وہ ڈھٹالی سے کندھے اچکا کر بولا تھا۔

"ہاں اک اسی معاملے میں بحث سو جتنی ہے میں تمہیں ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی ہانیہ سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔" سیمل نے کہا تو ہانیہ نے ڈیرنگ نعل کے سامنے کمرے ہو کھلے۔

"چلو تم لوگ میں آتی ہوں۔" اس نے بیگ سے نکالی چیزیں پھر اندر گھولیں سیمل نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"رہنے دو ابھی میں تمہارے لیے اپنے ساتھ والا کمرہ سیٹ کروا دوں گی۔"

"ساتھ والا۔" شیراز جھجھکا "وہ کمرہ میرا ہے۔"

"اب نہیں ہے۔" سیمل اطمینان سے بولی "تم اپنا سامان اٹھا کر کہیں بھی دفع ہو جاؤ۔"

"بابا ہریش میں ڈیر اڈال لوں۔" وہ بھٹنا کر بولا۔

"بھند شوق۔" اس نے مزے سے کہا اور ہانیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "آؤ چلیں۔"

"میں سچ بچ دوں خیمہ ڈال لوں گا۔"

"ضرور ضرور میں بھی مذاق نہیں کر رہی۔"

"مجھے ٹھنڈ بھی لگ سکتی ہے۔"

"مشکل ہے کینڈے کی کھال ہے۔" اس نے مزے سے کندھے اچکائے۔

"یہ۔ یہ میری آپلی ہیں؟" شیراز نے ہانیہ کو دیکھ کر گویا شکایت کی تھی۔

"کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو اسے سیمل! میں کہیں بھی رہ لوں گی۔" ہانیہ نے کہا اس نے فٹ سے نفی میں سر ہلا دی۔

"بالکل نہیں تم میرے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرو گی۔"

"تو دائیں طرف والا کمرہ لے لو۔" شیراز نے فوراً مشورہ دیا۔

وہ رامش بھائی کا ہے اینڈ یونو وہ جب بھی واپس آتے ہیں اپنے کمرے میں ہی ٹھہرتے ہیں۔" سیمل نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر ہانیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"اوکے ڈیر سسر! تمہارے لیے یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔"

"تھینک یو شیراز۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔"

ہانیہ نے مسکرا کر کہا۔

"تھینک گاڈ کسی نے میری اچھائی کو تسلیم تو کیا۔"

اب چلیں ناشتے پر ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔" شیراز نے ہاتھ پھیلا کر کہا تو وہ دونوں آگے چلی گئیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

"آخر تمہیں ہانیہ کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت

تھی۔؟"

ہانیہ کے اٹھتے قدم ساکن ہو گئے اور ساتھیوں ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ وہ کبھی تھی سب لوگ اس کے آنے پر خوش ہیں۔ مگر یہ بی بی جان تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔

"آپ بھی ایک بات کو لے کر بیٹھ گئی ہیں بی بی جان! اب چھوڑیں بھئی منظور ماموں کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی تھی۔ وہ مختصر تھی کہ ماما کچھ کہیں کی ٹمر اس کی جگہ پھر سے بی بی جان کی آواز ابھری تھی۔

"مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اس شخص کی اولاد کو کیوں ساتھ لیے پھرتی ہے۔"

"تو یہ لوگ بابا کے کئے کی سزا تھے دیں گے۔" اس کے دل و دماغ سلگ اٹھے۔

"بی بی جان! میرا تو خیال ہے اب اس ٹائیک کو بند ہی کر دیں تو بہتر ہے۔" ماما کی اکتائی آواز آئی تو بات بدل گئی۔

"میں ذرا فیکٹری جا رہا ہوں۔ شیراز اٹھے تو اسے بھی بھجوا دینا۔ سارا دن ادھر ادھر گزارتا ہے۔ ذرا دیکھو دار نہیں ہے یہ لڑکا منظور ماموں اٹھے تھے۔

"سارا دن تو گھسار رہا ہے تمہارے ساتھ۔" بی بی جان خود جو بھی مرضی کہہ لیں کسی دوسرے کو نہیں کہنے دیتی تھیں۔ ہانیہ پلٹ گئی۔ برآمد کے اختتام پر ہی کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ کھانے کی اشتہاء انگیز خوشبو باہر تک آرہی تھی۔ وہ بلا ارادہ ہی اندر داخل ہو گئی۔

"آؤ ہانیہ! آج تو بہت سوئیں۔" شاہدہ مامی نے آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔

"جی۔ سیمل کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہو گی۔" انہوں نے مگر میں گوشت ڈالا۔ ایک دو بار چلا کر ڈھک دیا اور خود موٹی کش۔ کرنے لگیں۔ ہانیہ یونہی دروازے کے ڈیرائن پر انگلی پھیرتی، نجابانے کیا سوچنے لگی تھی۔ شاہدہ ممانی نے خاموشی محسوس کر کے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا سوچنے لگیں ہانیہ۔؟"

ہانیہ چونکی۔ پھر سر جھٹک کر ان کے پاس آگئی۔

”میں کچھ پھیل کر آؤں۔“
”تمہیں کوئی آتی ہے۔“ کئی ہوئی مولیٰ انہوں نے وہی میں کس کی۔

”نہیں آتی تو نہیں۔“ ہانیہ نے قدرے شرمندگی سے کہا تو مسکرا دیں۔
”کوئی بات نہیں، میں تمہیں سکھا دوں گی۔“ انہوں نے محبت سے ہانیہ کو دیکھا۔ چند دن ہوئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے، مگر انہیں وہ بہت سلیجھی ہوئی اور پیاری لگی تھی۔

”آپ بہت مزے کا کھانا بناتی ہیں۔“ ہانیہ نے ستائشی نظروں سے انہیں دیکھا۔ بہت کیوت اور یک سی لگتی تھیں شاید انہی کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنے بڑے بچوں کی ماں ہیں۔

”کیا کریں مجبوری ہے۔“ بی بی جان سے لے کر شیراز تک ہر کوئی اچھا کھانے کا شوقین ہے۔ پھر ہر کسی کی انگ پسند اب تو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ جب دانش اور رامش رہا ہوتے تھے تو میرا سارا سارا دن کچن میں گزرتا تھا۔ سب سے کم تنگ مجھے رامش نے کیا ہے۔ باقی دونوں تو شیطان تھے پورے۔

بیٹے دور تھے اور ہر مل یاد آتے تھے۔ ہانیہ ان کے لیے میں ماسا کی ترب کو پوری طرح محسوس کر سکتی تھی۔ شاید انہی کا فیورٹ موضوع شروع ہو گیا تھا سو وہ بولتی چلی گئیں۔ دانش کی شرارتیں، شیراز کی معصومیت، رامش کی سنجیدگی۔

ہانیہ کے بے کل من میں دھند چھانے لگی۔ کتنے مینے گزر گئے۔ ماما کے لیے میں میرے لیے نہ ایسی ترب ہوتی ہے نہ پیار، کتنا دور چلی گئی ہیں ماما مجھ سے۔ اس کی سوچوں کی رخ اور اق کو شیراز کی آمد نے پلٹا تھا۔

”بس بہت ہو گیا۔ میرے ساتھ۔ ماما! مجھے اب اجازت دیں۔“ وہ بڑے غصے میں تھا۔
”میں نہیں دے رہی۔“ انہوں نے صاف کہہ دیا۔

”اف اس گھر میں میری کوئی قدر نہیں ہے، میں

اس گھر میں کود کر خود کشی کر لوں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

ساتھ ہی لہجہ بدل کر پوچھنے لگا۔
”پاپی! داوے! آپ نے کیا کیا ہے؟“
”جب کووے گے تو دیکھ لیتا۔“ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

”یعنی میں کوو جاؤں۔“ شیراز نے آنکھیں پھیلائیں۔
”شیراز مت تنگ کرو مجھے۔“
”تو پھر مجھے اجازت دیں۔“ وہ نرمٹھے بن کر بولا۔

”فرق میں بڑی بات ہے۔“ وہ جس روانی سے بولی تھیں، شیراز اسی روانی میں فرق کی طرف مڑا، ”شیراز! ہانیہ کی بے ساختہ ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے پلٹ کر پہلے ہانیہ کو پھر ماما کو دیکھا اور سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

”کبھی کبھی تو آپ ثابت کر دیتی ہیں کہ آپ میری ہی ماں ہیں۔“
”شیراز! پاپی! پاپی! ہر جاؤ وقت پر کھانا نہ ملا تو سب سے پہلے تمہی شور مچاؤ گے۔“

”مگر اجازت۔“
”اگر اجازت نہیں ماما! یہ کوئی وقت ہے سوات جانے کا۔“ سیمل نے اندر آتے ہی کہا۔
”تم بیٹھی فیضان بھائی کو کھانا لکھتی رہو، چپ چاپ وہ چکر بولا تھا۔ سیمل نے خبردار شاہدہ کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“
”یہ سوات درمیان میں کہاں سے آگیا۔“ شاہدہ نے چوما بند کیا اور قدرے فرصت سے شیراز کو دیکھا۔

”درمیان میں کہاں سے آتا تھا وہ اپنی جگہ پر ہے۔“
”بس مجھے وہاں جانا ہے۔“
”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈی کو بتا چلا تو وہ بہت غصا ہوں گے۔ پہلی کتے ہیں کہ تم کام سے

امریکہ میں مقیم ہے۔“
”اور شادی کب تک ہوگی؟“

”او مئی مئی او ڈیڈی ڈیڈی

”پتا نہیں۔“ وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی ”مجھے تو لگتا ہے وہ منگنی کروا کر بھول ہی گئے ہیں۔ اچھا چھوڑو تو باغیچے میں چلتے ہیں۔“ سیمل نے کہا تو وہ بھی اٹھ گئی۔
برآمدے کے گول ستون سے ٹیک لگائے شیراز منہ پھلائے کھڑا تھا۔ اور اس کا چہرہ آمدے میں اڑ کر آئے سوکھے پتوں کو مسلسل مسلسل رہا تھا۔
”کیا ہوا؟“ ہانیہ نے اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھا۔

”کچھ خاص نہیں، تھوڑی سی بے عزتی ہوئی ہے۔“ بی بی جان کے ہاتھوں، باقی کا فریضہ ڈیڈی انجام دیں گے۔“ اس نے کندھے اچکا کر کہا۔ ہانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا جبکہ سیمل ہنس دی۔
”یہ تو تمہارے معمولات میں شامل ہے ڈیرہ برادر۔“

”تم دیکھنا میں بھی اس دفعہ مالٹوں میں خرد برد کروں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔
”اور ڈیڈی سے جوتے کھاؤں گا۔“ سیمل نے جملہ مکمل کیا۔ شیراز نے خفگی سے اسے دیکھا۔
”تم میری دشمنی میں کبھی پیچھے مت رہنا آتی۔“

”ارے نہیں تم تو میرے پیارے سے چھوٹے سے بھائی ہو۔“ سیمل نے اس کا بازو تھام کر اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ ”میرے پاس اک زبردست آئیڈیا ہے۔ اب ہانیہ کے آنے کی خوشی میں اک پکنک منامیں گے۔“

”ڈیش گریٹ؟“ وہ فوراً ہی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور وہ تینوں اواکل سرا کی خنک مگر خزاں زدہ شام میں سوکھے پتوں کو اپنے قدموں تلے مسلتے لیے درختوں کی قطاروں کے نیچے سے گزرتے ہوئے یہ آئیڈیا ڈسکس کرنے لگے اور ان کے ساتھ چلتی ہانیہ سوچ رہی تھی۔

کتنے خوش قسمت ہیں یہ لوگ، محبت کی ڈور میں بندھے ہوئے ایک مکمل ٹیمیل۔

”فیضان؟“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ ”مامی فانیسی۔“ اس کے انداز میں ہلکا سا شرمیلا پن ابھر آیا تھا۔

”اوہ۔۔۔“ ہانیہ نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ تو شرمیلیں مسکان نے اس کے گلابی لبوں کا احاطہ کر لیا۔

”ہماری انگیجمنٹ بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔“ میرے ماموں کے بیٹے ہیں وہ۔ شروع سے ان کی فیملی امریکہ میں مقیم ہے۔“

”اور شادی کب تک ہوگی؟“

62

او مئی مئی او ڈیڈی ڈیڈی



او مچی ڈیڈی

ہو جاؤ ریڈی

جس سے میری شادی ہوگی

آج میں نے وہ لڑکی ڈھونڈ لی ہے

شیراز کی گنگنا نہیں عروج پر تھیں۔ ام کے سائے

میں جھولے پر اونہ حارہ وہ کب سے یہی گانا گارہا تھا۔

”یہ گھنٹے بھر سے کیوں آوازیں دے رہے ہو

مجھے۔“ آئی شلہ اون سلاسیاں ہاتھ میں لیے بڑی

فرصت میں باغیچے کی طرف نکلی تھیں۔

”ہائیں۔“ اس کے گانے کو بریک لگ گئی۔

”آپ کو نہیں پکار رہا تھا گانا گارہا ہوں۔“

”مجھے تو وال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔“ سیمل نے

بانہیہ کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔

”اف۔! آپ نے آج وال پکائی ہے۔“ وہ جھنجھلا

کرا تھا۔

”تو وال تمہیں کاٹی ہے کیا؟“

بی بی جان کو وال بہت پسند تھی تب ہی ذرا گھور کر

کہا۔ وہ سب کی سب بڑی فرصت میں یہاں بیٹھنے اور

خاندان بھر کے معاملات دسکس کرنے آتی تھیں۔

”اومائی سوٹ لی بی جان! آپ یہاں بیٹھیں۔“

شیراز نے انہیں فوراً ”اندھوں سے تمام کر لکڑی کے

منقش جھولے پر بٹھایا۔

”اب ذرا سوچ کر بتائیں کہ میں کس مبارک دن

پیدا ہوا تھا۔“

”پھر وہ دن مبارک کس طرح ہوا؟“ سیمل نے

سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

”تمہیں کیا معلوم کیا یاد گار دن تھا وہ اس دن تو

چھٹی ہو جانی چاہیے تھی۔“ وہ خوش سے بولا۔

”بالکل لوگ سائے اسی طرح یاد رکھتے ہیں۔“

سیمل نے منہ بنا کر کہا۔

”سانچہ کیوں کتنی خوشی منائی تھی ہم نے

سارے خاندان میں۔“

”مالے تقسیم کیے تھے۔“ سیمل نے نکوا لگایا۔

”مالے تمہاری دفعہ بانٹے گئے تھے میری دفعہ تو

خالص قلاقہ تھا۔“

”خیر قلاقہ تو نہیں حلوائی کو گھر بلوا کر لڈو بنوائے

تھے۔“ بی بی جان نے بتایا۔

”وہ کالا موٹا شیدا حلوائی نا۔“ سیمل نے شرر سے

لہجے میں پوچھا تو وہ تڑپ کر مڑا۔

”کالا تھا تو کیا ہوا۔ لڈو تو کالے نہیں تھے۔“

”کس بے معنی بحث میں الجھ گئے تم لوگ؟“ عالیہ

نے ٹوکا تو وہ صبح سے بی بی جان کے پاس آ بیٹھا۔

”آبی خواخوہ ٹوک دیتی ہیں آپ بتائیں بی بی جان

میں کب پیدا ہوا ہوں۔“ وہ اپنے سابقہ سوال پر واپس

آیا۔

”دن تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ مگر جاتی سر دیوں کے

دن تھے۔ مبارک کاموسم تھا۔“

”مجھے یقین تھا۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”خالا نکہ اس موسم کا تم پر کوئی اثر ہی نہیں لگتا۔“

سیمل کی زبان پھر پھسل گئی۔

”ہری بات ہے بیٹا اچھو نے بھائی کو یوں تنگ نہیں

کرتے۔“ عالیہ نے بازو سے تمام کر سیمل کو اپنے پاس

بٹھایا۔ بانہیہ نے دیکھا اور پھر سے شیراز کی طرف

دیکھ ہوئی۔

”یعنی اب میں پورے تیس برس چار ماہ کا ہو گیا۔“

اس نے شلہ آئی کے بتانے پر حساب لگایا۔

”لیکن تمہیں کتنی یہ حساب کیوں سوجھ رہا ہے؟“

شلہ آئی نے پوچھا۔ ان کے ہاتھ تیزی سے سویٹر

بن رہے تھے وہ اون کا گولا ہاتھ میں لیے کر بیٹھ گیا۔

”مما! آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے بیٹے کے

سرے کے پھول کھل جائیں۔“

”نہیں میرا دل نہیں چاہتا۔“ وہ بے نیازی سے

بولیں۔

”ہیں۔“ اس کا منہ کھل گیا۔ پھر تاسف سے سر

ہلاتے ہوئے بولا ”یا اللہ کیسی ظالم ہیں آپ؟“

”مگر تمہیں یہ سرے کے پھول کیوں یاد آرہے

ہیں؟“ بی بی جان نے مٹھوک نظروں سے اسے

دیکھا۔

”اور ابھی تم وہ گانا بھی گارہے تھے۔“ بانہیہ نے یاد

دلایا۔

”مجھے تو وال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔“ بی بی کھٹک

تھیں۔

”پھر وہی وال۔“ وہ سر تمام کر رہ گیا۔

”کالی ہے نا۔“ سیمل نے پوچھا۔

”ہاں ہے۔“ اس نے گردن اکڑا کر کہا۔ ”مما!

آپ میری شادی کر دیں۔“

”ہیں۔“ شلہ آئی بری طرح چونکیں ”دماغ تو

ٹھیک ہے رامش اور سیمل سے پہلے کس طرح

کر دیں۔“

”تو ان کے انتظار میں کیوں بوڑھا ہو جاؤں۔ ان

مخمرہ کے پیا جاتیٹھے پر دیں۔“ بانہیہ نے کب واپس

آئیں اور وہ بڑے بھیا۔ دیکھ لیتا آپ لوگ ایک دن

آکر فرما جائیں گے۔“ میری شادی ہو چکی ہے فوج

سے۔“ وہ نقل اتار کر بولا۔ ”بلا وجہ فضول۔“

”بی بی جی رامش صاحب کا فون ہے۔“ ثریا

پر کھڑے تھیں کھڑی پکار رہی تھی۔

”ٹیس شیطاں کو یاد کیا وہ حاضر۔“ شیراز سب سے

آگے لپکا تھا۔ سب ہی چلے گئے تھی کہ بی بی جان بھی۔

عالیہ نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔ بانہیہ وہیں

جھولے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ عالیہ بیٹھ گئیں۔ بانہیہ

نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”تم یہاں خوش تو ہونا بانہیہ۔“

”ہاں۔“ عالیہ کو اس کا لہجہ سپاٹ سا لگا۔

”سیمل اور شیراز کے ساتھ بہت دوستی ہو گئی ہے

تمہاری۔“

”جی۔“ وہ یونہی جھولے کی کڑیوں پر نگاہ جما کر

بولی۔

”تمہارے پیپا کا فون آیا تو انہیں کہہ دینا کہ تم یہاں

بہت خوش ہو اور سب لوگ تمہارا بہت خیال رکھتے

ہیں۔“

بانہیہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ وہ نظریں چرا

گئیں۔

”یہ یقین دہانی کرانا ضروری ہے کیا؟“

”ہاں ضروری سمجھ لو۔“

”میرا نہیں خیال آپ کو پیپا کی مرضی کا اتنا زیادہ

خیال کرنا چاہیے۔“ عالیہ کو اس کا لہجہ طنزیہ لگا۔

”بانہیہ۔۔۔!“ انہوں نے قدرے بے یقینی سے

اسے دیکھا۔ بانہیہ نے ہوا میں اڑتا پتا تھا۔ پھسل پر

مسلا اور پھونک مار کر اڑا دیا۔

”ہم گھر کب جائیں گے ماما؟“ اس نے اچانک

پوچھا۔

”یہ بھی تو گھر ہے بانہیہ!“

”یہ میرا گھر نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا بھی گھر ہے۔“ وہ زور دے کر بولیں۔

”ماما۔۔۔“ بانہیہ نے جھنجھلا کر انہیں دیکھا۔ ”یہ

منظور ماموں کا گھر ہے۔ سیمل اور شیراز کا۔“ میرا یا آپ

کا نہیں بھلے وہ کتنے بھی اچھے ہوں مگر ماما میں یہاں

ایزی فیل نہیں کر رہی۔“

عالیہ کے اندر خزاں زدہ ہواؤں کی سائیں سائیں

کچھ اور برہہ گئی۔ انہوں نے سر اٹھا کر بانہیہ کو دیکھا تو

ان کی آنکھوں میں امید کاغذی ناؤ کی طرح ڈول رہی

تھی۔

”اگر میں یہ کہوں بانہیہ کہ میں اب اس گھر میں کبھی

واپس نہیں جاؤں گی تو۔“

”آپ پیپا کے ساتھ تعلق تو زبردی ہیں؟“ بانہیہ نے

چونک کر انہیں دیکھا اک مضحکہ سی مسکراہٹ ان

کے لبوں پر ابھر کر ڈوب گئی۔

”تعلق تھا ہی کب جو ٹوٹ جاتا۔“

”اور میں۔۔۔ میرے بارے میں کیا سوچا ہے آپ

دونوں نے؟“

”تم۔۔۔“ انہوں نے سوچتی نگاہوں سے اسے

دیکھا۔

”یا آپ فیصلہ کرتے ہوئے بھول گئی تھیں مجھے

۔۔۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

عالیہ تڑپ اٹھیں۔ ”مجھ سے اس لہجے میں بات

کرنا۔“

مت کرو ہانیہ۔

غیر محسوس طور پر ان کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

”ماما! میری پرانی یہ ہے کہ میں جتنی محبت آپ سے کرتی ہوں اتنی ہی پیلا سے بھی کرتی ہوں۔“

”نہیں۔“ عالیہ نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ”تمہاری پرانی یہ ہے کہ تم کبھی مجھے انڈر اسٹینڈ نہیں کر سکیں۔ تم نے ہمیشہ احمد کی بیٹی بن کر سوچا ہے۔“ ان کے انداز میں وہی اجنبیت دور لگی تھی۔

”ایسا نہیں ہے ماما! آپ کو اگر یاد ہو تو ہم ہمیشہ ماں بیٹی سے زیادہ ایک دوسرے کے فریڈز رہے تھے۔ مگر اب مجھے لگتا ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے آپ نے پیلا کے ہر غلط فیصلے کی سزا مجھے دی ہے۔“

”ایسا نہیں ہے ہانیہ۔“ انہوں نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما تھا۔ ہانیہ نے دھیرے سے ان کے ہاتھ الگ کیے۔

”ایسا ہے ماما! اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ جب سے یہاں آئی ہیں آج پہلی بار مجھ سے بات کر رہی ہیں۔“

”ہانیہ! میں ایسا نہیں کرنا چاہتی ہوں مگر۔“

”مگر یہ کہ آپ بھی ہر کسی کی طرح پیلا کے ہر فعل کے لیے مجھ ذمہ دار سمجھتی ہیں۔“

”ہانیہ! وہ ششدر سی رہ گئیں۔ شاید انہیں احساس بھی نہ تھا کہ وہ لاشعوری طور پر اپنے رویے سے ہانیہ کو کس حد تک ہرٹ کر چکی تھیں۔

”جی ماما! اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ بی بی جان کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔“ وہ انہیں متحیر اور شرمندہ سا چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی۔

”یہ آپ کی گھڑی میں سیل ختم ہو گئے ہیں کیا؟“ شیراز کے پوچھنے پر وہ چونک گئی۔ بے اختیار کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

”نہیں چل رہی ہے۔“ شیراز ہنس دیا۔ اس کے ہاتھ میں سیب کی شکل والی

سرخ ٹرے میں دو بڑے بڑے گریپ فروٹ تھے دو سرے ہاتھ میں چھری تھی۔

”میں اس گھڑی کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے چھری ہانیہ کے چہرے کے گرد گھمائی۔

”کیوں ٹھیک تو ہے۔“

”کثر ایک ہی وقت بتاتی ہے پائے داوے کس سوچ میں گم رہتی ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں سمجھتی میں تو سیمل کا انتظار کر رہی تھی۔“

”کیس؟“ وہ تو نہیں یاد آرہا ہے۔“ اس نے راز داری سے پوچھا۔

”وہ کون؟“ ہانیہ نے چونک کر پوچھا۔

”آئی میں! میں گھر میں لڑکیوں کے یہ ”وہ“ ہوتی جاتے ہیں۔“ وہ کان کھجا کر بولا۔

”نہیں میرے کوئی وہ نہیں ہیں۔“ ہانیہ ہنس دی۔

”ملائیں ہاتھ۔“ شیراز نے جوش میں ہاتھ ملایا پھر اس کی طرف جھک کر بولا ”میری بھی نہیں ہے۔“

”مگر سیمل تو کمرے کی وال میں کچھ کالا ہے۔“

”تو سیمل تو کمرے کی وال میں کچھ کالا ہے۔“

”نہیں! وہ سیمل تو کمرے کی وال میں کچھ کالا ہے۔“

کرتا۔ میری صحت خوبصورتی اور خوش مزاجی کا راز ہر روز ایک نوکرا چکوتروں کا۔“ اس نے پلیٹ ہاتھ میں پکڑ کر گھمائی۔

”ایک نوکرا خدا کا خوف کرو۔“ ہانیہ ہنسی۔

”یہ جج کچا جاتا ہے۔ اور تم ذرا جلدی اٹھو، لُج تک واپس آتا ہے۔“

”مما کڑھائی گوشت اور کالمی چٹوں کا پلاؤ بتا رہی ہیں۔“

”ہم بھی سدھارتے ہیں کچن میں۔ مگر تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

”قریبی باغ تک، مجھے اپنی پینٹنگ مکمل کرنا ہے۔“

”اور ہانیہ کی سہیلی ہو جائے گی۔“ سیمل نے کہا۔

”چلو میں بھی چلتا ہوں۔“ وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

”گیت سے نکلتے ہی وہ لوگ قلمی طرف مڑ گئے، شیراز نے سیمل کے ہاتھ سے ایزل لے لیا۔ باغ کے کنارے کنارے کھجور کے درخت لگے تھے۔ شیراز ہانیہ کو مالٹوں کی مختلف قسموں سے متعارف کروانے لگا۔

”ہر پودا سنگتروں سے بھر اہوا تھا۔ جھولتی ہوئی شاخیں پھل کے پوچھ سے جھکی سبز گھاس کو چھو رہی تھیں۔ نم ہوا میں کھٹی میٹھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔“

”بس دس پندرہ دنوں میں پھل اترنا شروع ہو جائے گا۔“

”شیراز نے اک سرخی مائل کینو کو ہاتھ میں لے کر جائزہ لیا۔“

”یہ پک تو گیا ہے۔“ ہانیہ نے سب سے نیچے جھکی

گاہ۔ ”شیراز نے پلیٹ کر دیکھا۔ سیمل اپنا ایزل سیٹ کر رہی تھی۔“

”فیکٹری دیکھنے چلیں گی۔“ اس نے آفری۔

”کتنی دور ہے؟“

”ہانیہ! مت جانا، تمیں پینتیس منٹ کی واک ہے۔ پھر واپس بھی آنا ہوگا۔“ سیمل نے گھر نکالتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھی اتنا چلنے کی ہمت نہیں ہے۔“ ہانیہ نے انکار کیا۔

”چلیں جانے دیں، کسی دن جیب پر لے چلوں گا۔“ شیراز نے سر جھٹکا پھر سیمل کو کام میں مصروف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”ہم ذرا گھوم پھر آئیں۔“

”ہاں! ہانیہ کو باغ کی سیر کروادو، مگر پلیز زیادہ دور نہیں جانا۔“

”پتا ہے مجھے آپ کو ڈر لگتا ہے۔ میں اس پاس ہی ہوں۔ دو چار چٹیں مار دوں گے گا، ہم آجائیں گے۔“

”سیمل نے اسے کھور کر دیکھا۔ بولی کچھ نہیں، وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔“

”آپ نے وہ کہانی سنی ہے، جس میں اک جاوہر شہزادی کو ایک سنگترے میں بند کر دیتا ہے اور وہ سنگترہ اک غریب لکڑہارے کا خوبصورت بیٹا خرید لیتا ہے۔“

”میں جب بھی کوئی سنگترہ چھینے لگتا ہوں تو ایک بار تو مجھے لگا۔“

”شیراز کی ان ہی باتوں میں وہ بہت دور نکل آئے تھے۔ آگے چراگاہ اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تب ہی ہانیہ کی سماعتوں نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی۔ اور دوسرے پل اس کی نگاہوں کی زد میں خوبصورت سفید گھوڑا آگیا۔“

”یہ کس کا گھوڑا ہے؟“ وہ بے اختیار رک گئی۔ اسے خود بھی رائیڈنگ کا بہت شوق تھا۔

”اپنا ہی ہے۔“

”مگر ماما بتا رہی تھیں کہ اب یہاں گھوڑے نہیں ہوتے۔“

”ہوتے ہیں۔“ شیراز نے کہا پھر خود ہی اپنے جملے سے معنی اخذ کر کے جلدی سے بولا۔

”میرا مطلب ہے ایک گھوڑا ہوتا ہے۔“
”وہ تو میں نے دیکھ لیا۔“

”تو میری طرف کیوں دیکھ رہی ہیں گھوڑا ادھر ہے۔“ وہ سٹٹا کر بولا تھا۔ ہانیہ ہنس دی۔

”میں تو اسی کی بات کر رہی ہوں۔“
”تھینک گاڈ میں سمجھا، خیر۔“ کان کھجاتے ہوئے اس نے جملہ ادھر اچھوڑا ”یہ رامش کالا ڈالا گھوڑا ہے۔“

”بہت خوبصورت ہے۔“ ہانیہ کی نگاہوں نے آخری سرے تک مفید گھوڑے کا پیچھا کیا تھا۔

بہت دیر تک ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ لوگ واپس ہوئے۔ سیمل اپنے کام میں مگن تھی۔ بلغ کا ایک حصہ اور بہت دور نظر آتے کچے کے مکانات ان کے عقب میں شیشم کے ٹنڈ مندرخت، سورج نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اس کی زرد کرنوں کا غبار سارے منظر پر چھایا تھا۔

”بہت خوبصورت ہے۔“ ہانیہ نے بے اختیار تعریف کی تو وہ چوکی۔

”آگے تم لوگ واپس کیسے لگے ہمارے باغات۔“
”یہ تو اک ڈرامہ لینڈ ہے سیمل! اک آئیڈل لائف، میرا بس چلے تو میں ساری عمر یہاں گزار دوں۔“ یہ اس کی بے ساختہ فیملنگز تھیں جن کا اظہار وہ بے اختیار کر گئی۔ سیمل اور شیراز کی سوچیں ہونٹیں

نگاہیں اک دوسرے سے ٹکرائیں اور وہ دونوں ہی مسکرا دیے۔

”اب چلیں، آئی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ خود ہی چونک کر بولی۔

”یوں کہیں نا، کڑھائی گوشت اور پلاؤ یاد آ رہا ہے۔“ شیراز نے چھیڑا۔

”ہاں کچھ یہ بھی ہے۔“ اس نے جنتے ہوئے اعتراف کیا۔ سیمل نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ واپس لوٹے تو شاہدہ آئی کھانے کی میز

سیٹ کر رہی تھیں۔ وہ بہت خوشگوار موڈ کے ساتھ ان سب کے درمیان بیٹھی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥ ♥
”ہانیہ بیٹا! اندر آ جاؤ سردی بڑھ رہی ہے۔“

شاہدہ آئی نے پکارا تھا۔ مگر وہ سنی آن سنی کر کے بیٹھی رہی۔ سردی اسے بھی محسوس کر رہی تھی۔ مگر اٹھنے کا من نہیں تھا۔ یونہی جھولے پر نیم دراز اپنی

شال کے دھاگے پھینچ رہی۔
”میرا خیال ہے اب غریب کوئی اہم چیز ایجاو کرنے والی ہیں۔“ شیراز نے زور سے جھولے کو

حرکت دی تھی۔
”فوف۔“ اس نے سنبھل کر گھورا۔ تو وہ ڈھٹالی سے بننے لگا۔

”کیا سوچنے لگی ہیں آپ؟“
”کچھ نہیں، کبھی کبھی یوں ہی خاموش اور تنہا بیٹھنے کو مل جاتا ہے۔“

”تو کیا میں جاؤں۔“
”ہاں تو نہیں کہا میں نے ماما کیا کر رہی ہیں۔“

”آپ کے پاپا کا فون آیا ہے بات کر رہی ہیں۔“
”پاپا کا فون۔“ ہانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

جب سے وہ یہاں آئی تھی پاپا نے ایک بار بھی اس کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ ماما ماما کے ساتھ ان کی

روائی تھی مگر وہ ان کی اولاد تھی۔
”مجھے بلایا تک نہیں۔“

”عالیہ پھوپھو کو بلایا تھا انہوں نے لگتا ہے کوئی سیریس بات ہے۔“

”آج تھا۔“ وہ خاموش سی ہو کر سوچنے لگی کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔

”آپ کو اگر بات کرنی ہو تو دوبارہ فون کر لیجیے گا۔“
اسے خاموش دیکھ کر شیراز نے کہا تھا۔

”ہاں کر لوں گی۔“ ہانیہ نے آہستگی سے کہا۔ اور اس کی بے توجہی محسوس کر کے شیراز جلد ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ کچھ لمعے بیٹھی رہی۔ اس کے بعد ماما کے کمرے

میں آئی تھی مگر وہاں سب ہی موجود تھے۔
”ماما! پاپا کا فون آیا تھا۔“ اس نے دروازے ہی میں کھڑے ہو کر پوچھا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے

ماحول کی کشیدگی بھی محسوس کی تھی۔ ماما کی آنکھیں سرخ اور سوختی ہوئی تھیں شاہدہ آئی متفکر اور ماموں

اور بی بی بہت غصے میں تھے بلکہ بی بی جان نے اسے جن نگاہوں سے گھورا تھا ان میں سوائے نفرت کے اور کچھ نہ تھا۔

”ہاں۔“ ماما کی تھکی تھکی سی آواز ابھری۔
”کیا کہہ رہے تھے؟“

بی بی جان نے بہت زور سے پہلو بدلا تھا۔ ماموں لب بلی کر رہے تھے۔ ہانیہ اپنی جگہ چوری ہو گئی۔

”کچھ نہیں تمہارا پوچھ رہے تھے۔“ انہوں نے آہستگی سے بتایا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ پاپا! پاپا نے ایسا

کیا کہہ دیا کہ آپ رونے لگیں۔
”مگر سب لوگ اس کی آمد پر گویا ڈسٹرب ہو رہے تھے وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔“

”تو وہ جانتی تھی کہ یہ سب لوگ اس کے پاپا کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اور اس کی مجبوری یہ تھی کہ پاپا کی تمام تر خاموشیوں اور دوسری شادی کے باوجود وہ ان سے

محبت کرتی تھی۔ اور وجہ جاننے کے لیے وہ شعوری طور پر دروازے پر ہی رک گئی تھی۔“

”بس بہت ہو چکا عالیہ! اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔“ ماموں کی ضبط کی جھڑپوں کو توڑتی آواز ابھری تھی۔

”میں کیا کروں بھیا! میرے اختیار میں ہے کیا؟“
ماما رو دی تھیں۔

”کیوں نہیں ہے تمہارے اختیار میں کچھ۔“
”آپ جانتے ہیں میری کمزوری۔“

”یہ کمزوری کی کمزوری ہے۔ جسے تم نے گلے لگا رکھا ہے۔“ بی بی نے ترخ کر کہا تھا۔

”دیکھو عالیہ! جو کچھ وہ اب کہہ رہا ہے نا، وہ ماننا ناممکن ہے۔“ منظور ماموں نے رسائیت سے سمجھانا

چاہا۔

”جب تک ہانیہ میرے پاس ہے مجھے اس کی ہر بات ماننا ہوگی۔“ شاید وہ رو رہی تھیں ہانیہ کے لب بلی گئے۔

”تو واپس کر دتا“ اب وہ ننھی بچی تو نہیں رہی جسے گلے سے لگائے پھر رہی ہو۔ کل کو۔“

”ہانیہ! یہاں کیا کر رہی ہو۔“ سیمل کی آواز پر وہ پلٹی، سیمل اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گئی۔

”کچھ نہیں۔“ اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتی، ہانیہ چلی گئی تھی۔ سیمل کندھے اچکا کر رہ گئی۔

رات کو اس نے ماما سے پوچھا کہ پاپا نے کیا کہا تھا، مگر وہ کوئی بھی سلی بخش جواب نہیں دے سکیں۔ وہ

ان سے مزید خفا ہو گئی۔ کیا اب وہ اس قائل نہیں رہی تھی کہ ماما اس سے اپنی کوئی پرابلم شیئر کرتیں۔ یا وہ سمجھتی تھیں کہ وہ ماما کے بجائے ہمیشہ پاپا کا ساتھ دیتی

ہے۔ حالانکہ زیادتی پاپا کی طرف سے ہوتی تو وہ ہمیشہ ماما کا ساتھ دیتی تھی۔ اور چند دن بعد جب ماما نے کہا کہ وہ

لوگ یہاں سے جارہے ہیں تو پھر اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔ ”پاپا کے پاس؟“

”نہیں۔“ وہ خاموشی سے پکینگ کرتی رہیں۔
”تو۔“ اس نے الجھن آمیز انداز میں انہیں دیکھا۔

”یہیں ماڈل ٹاؤن میں ایک گھر لیا ہے میں نے اپنے اور تمہارے لیے۔“ عالیہ قصداً ”مسکرائی

تھیں۔ ہانیہ کچھ لمحے انہیں یوں دیکھتی رہی۔ جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس موقع پر اسے کیا کہنا چاہیے۔

”میرا خیال ہے تمہیں بھی پکینگ کرنی چاہیے۔“ کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے

ہانیہ کی خاموشی سے خائف ہو کر کہا تھا، ہانیہ اک طویل سانس لے کر بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

”میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں ماما!“ اس کی الجھن اس کی آواز سے مترخ تھی۔

”تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ عالیہ سپاٹ لمبے میں بولی تھیں۔

روبیہ کیسا ہو گیا تھا۔ کبھی وہ بالکل سہلے کی طرح مہیاں ہو جاتیں۔ ویسی محبت، ویسی وارفتگی، بالکل ویسی ہی دوستی اور کبھی کبھی ہانیہ کو لگتا تھا اس کا وجود بوجھ لگتا ہے۔ وہ اس سے بیزار ہو جاتیں۔ وہ کب آتی ہے اور کب جاتی ہے۔ وہ کیا کھاتی ہے، کہاں رہتی ہے۔ وہ بھول ہی جاتیں کہ ہانیہ احمد کا کوئی وجود بھی ہے۔

”ہانیہ احمد! کبھی تھوڑا وقت مجھے بھی دے دیا کرو۔“ اسے اوپر جاتا دیکھ کر انہیں غصہ ہی تو آیا۔ تب ہی اسے پورے نام سے مخاطب کیا تھا۔

ہانیہ نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ اسے ماما کا وقت دینے کا انداز بہت برا لگتا تھا۔ بظاہر ساتھ بیٹھ کر بیوی پر نظریں جمائے وہ اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو جاتی تھیں جب سے وہ اس گھر میں شفٹ ہوئی تھیں ماما کے رویوں کا یہ تضاد کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گیا تھا۔

”ماما کہاں ہیں عبدل؟“ عبدل کو پیلا نے مستقل یہاں بھجوا دیا تھا۔

”وہ تو اپنے بھیا کے گھر گئی ہیں۔“

”آج صبح۔“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”تو بجے ہیں۔“ عبدل نے گویا اطلاع دی تھی۔

ہانیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”چلے ملے گی آج۔“

”صرف چائے۔ ناشتہ بالکل تیار ہے۔“

”لے آؤ۔“ وہ کسلمندی سے ڈانٹتے چہرے پہنچ کر بیٹھ گئی۔ ذہن میں یہی سوچ بھٹک رہی تھی کہ ماما اتنی صبح ماموں کے گھر کیا لینے گئی ہیں۔

تب ہی فون کی بیل چنچ آئی۔ ہانیہ نے اٹھایا تو شیراز تھا۔ چھوٹے ہی پوچھنے لگا۔

”کیا شرمیں کر فوٹا فڈ ہو گیا۔“

”نہیں تو کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تو کیا آپ گوشہ نشین ہو گئی ہیں؟“

”ایسا بھی نہیں۔“

”حد ہوتی ہے بے مروتی کی بھی۔ کبھی پلٹ کر بھی

دیکھ لیتے ہیں محترمہ۔ ہر جگہ پتھر ہو جانے والی بات صادق نہیں آتی۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”میں آؤں گی۔“

”نہیں! آپ بالکل مت آئیے گا۔ ہم آپ کو بالکل بھی یاد نہیں کرتے۔“ شیراز کے روٹھے روٹھے انداز پر اسے پیار آیا۔

”چھوٹا اٹھا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شام کو چکر لگاؤں گی۔“

”آج نہیں۔“ اس نے فرمائش کی۔

”بھی کیا خاص بات ہے؟“

”ہاں نا۔“ وہ پر جوش ہوا۔ ”رات کو اچانک رامش بھائی آگئے۔ میں نے چھوٹا چا موخ اچھا ہے کوئی لڑکی ڈھونڈ کر انہیں باندھ واندھ کر منگنی کر دی ہے۔“

”ہاں! کتنا شوق ہے تمہیں منگنی کروانے کا۔“ وہ

”مجھے کنوارہ مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تو پھر آؤں گی۔“

”مجھے تو میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔“

”ہمارے ہاں کسی نے بھی روزہ نہیں رکھا۔ باقاعدہ ناشتہ بنا ہے اور سب کے سب لگے ہوئے ہیں۔ مولیٰ بھرے پر آئی ہیں۔“

”مجھے نہیں شیراز۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ فوراً مان گیا۔ مگر اس کا لہجہ مایوس سا تھا۔ ہانیہ کو افسوس ہوا۔ اس نے خدا حافظ کہہ کر جلدی فون بند کر دیا تھا۔

”تو یہ وجہ تھی آپ کے اتنی صبح جانے کی۔ مجھے بتانا گوارا نہیں کیا۔ گویا مجھ سے زیادہ آپ کو ہر کوئی اہم لگنے لگا ہے۔“

ناشتہ کرنے کا مایوس نہیں رہا تھا سو وہ پونہی اٹھ گئی۔ ماما دپہر میں لوٹی تھیں اور بہت پر جوش تھیں۔ اس سے رامش کے معلق باتیں کرنا چاہتی تھیں مگر ہانیہ نے موقع ہی نہیں دیا تھا اور گاڑی لے کر نکل گئی۔

ان کی بات پر ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ جسے خود ہی چوری بن گئیں یہ بات کہہ کر بی بی جان کے انداز میں واضح بیزاری تھی۔

”ہم کیا کہتی ہو شاہدہ؟“ منظور صاحب نے بہت دیر بعد سر اٹھا کر ان سے پوچھا تھا۔ انہوں نے ایک نظر بی بی جان اور پھر عالیہ پر ڈالی۔

”ہانیہ بہت اچھی لڑکی ہے اور مجھے پسند بھی بہت ہے۔“

ان کی بات پر عالیہ کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

”لیکن احمد کی بیٹی۔“ بی بی جان نے تذبذب سے کہا۔

”وہ میری بھی بیٹی ہے۔“ عالیہ تڑپ اٹھیں۔

بی بی جان!

وہ بی بی جان کی طرف پلٹیں۔ ”میں نے زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ احمد نے کبھی کوئی خوشی نہیں دی مجھے۔ اگر ہانیہ نہ ہوتی تو شاید میں اس دھوکے باز انسان کے پاس ایک بل بھی نہ رکتی۔ چھوٹا آئی وہ گھر۔ میرے قدموں کو اگر کسی نے باندھا تھا تو وہ میری ہانیہ کا وجود تھا۔ اب وہ ہانیہ کو مجھ سے چھین لیتا چاہتا ہے۔ وہ چھین لے گا بی بی جان! خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔“

بی بی جان بیٹی کو ساتھ لگا کر سسک اٹھیں۔ ساری عمر انکو بیٹی کے ذرا ذرا سے دکھ پر وہ تڑپتی تھیں۔ آج وہی بیٹی ان سے مدد مانگ رہی تھی اور وہ بے بس تھیں۔

”یہ تو شاہدہ اور منظور کا فیصلہ ہو گا۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے پھر شاہدہ نے ہی ہمت کی تھی۔

”عالیہ! ہانیہ مجھے سہل کی طرح عزیز ہے۔ وہ تو اتنی سلجھی ہوئی لڑکی ہے کہ کوئی بھی اسے بھونٹ کر فخر محسوس کرے گا۔ مگر رامش۔“ وہ ایک پل کو خاموش ہو گئیں۔

”رامش کیا کیا۔ کیا وہ کہیں۔“ عالیہ نے تیزی سے پوچھنا چاہا تو شاہدہ مسکرا دیں۔

”نہیں۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں جانتی ہوں ایسا کچھ نہیں ہے مگر اس کی رائے لیے بغیر تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، مگر تم فکر مت کرو وہ انکار نہیں کرے گا۔“

”مگر عالیہ! تم ہانیہ سے ضرور پوچھ لینا۔ وہ کسی اور ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ یہاں ایڈجسٹ بھی کر لے گی۔“ منظور صاحب نے کہا۔

”ہرے۔“ کھڑکی سے کان لگا کر کھڑے شیراز نے نعرہ لگایا۔

”خاموش۔“ سہل نے تیزی سے اسے گھورا۔

”ہانیہ! بھابھی بن کر آئیں گی تو کتنا مزہ آئے گا نا آپ؟“ وہ بہت پر جوش تھا۔

”ہاں۔ ہانیہ مجھے بھی بہت اچھی لگی ہے۔ خوبصورت بھی بہت ہے۔ رامش بھائی کے ساتھ سوٹ کرے گی۔“ سہل بھی خوش تھی۔

”مگر۔“ وہ نجانے کس سوچ میں الجھ گیا تھا۔

”مگر کیا۔؟“ سیمل نے پوچھا۔

”ہانیہ آپ کی جان جائے گی؟“

”ہمارے بھائی میں کس چیز کی کمی ہے۔“ سیمل

نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”تو ہانیہ آپ کو فون کروں۔“

”حق ہو۔“ سیمل ہنس دی۔ ”کیا کہو گے؟“

”یہی کہ ہمارے بھائی کو اپنی فرزندگی میں قبول

کر لیں۔“ وہ روانی سے کہہ گیا۔

”فرزندگی میں۔ او گاڈ۔“ سیمل ہنستی چلی گئی۔

”م۔ میرا مطلب ہے کہ۔“ وہ جھل سا ہو کر کان

کھجانے لگا تھا۔

”رہنے دو مطلب اور یہ سوچ کہ وہ بھائی اور

ہانیہ کی ملاقات کیسے کروائی جائے۔“

”دش بوائے۔“ وہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے

تھے۔

”کتی۔“ اور بے رنگ زندگی ہے۔“

”سمجھنے والوں کے لیے۔“

خشک چوں کو قدموں تلے روندتی ہانیہ نے سراٹھا

کر قدرے ناگواری سے کہہ دیا۔

”ہیلو۔“ ڈارک براؤن آنکھیں مسکرائیں۔

”آپ کا مطلب ہے کہ جن لوگوں کو زندگی بہت

بے رنگ اور خشک نظر آتی ہے وہ خود اسے ایسا سمجھتے

ہیں۔“ اسکارف کو جھٹکا دیتے ہوئے اس نے جرح

کی۔

”کم از کم آپ کے بارے میں میں یہی سمجھتا

ہوں۔“ کولتار کی سیاہ سڑک خشک چوں سے بھری

تھی۔ سرد ہوا میں گرتے چوں کی آہٹیں شامل تھیں۔

وہ رک گئی۔

”آپ تو مجھے جانتے بھی نہیں پھر میرے بارے

میں اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”کون کہتا ہے میں آپ کو نہیں جانتا؟“

ہانیہ نے ایک پل کو سوچا پھر سر جھٹک کر بولی۔

”میں آپ کو نہیں جانتی۔“

”یہ کہہ سکتے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں

میں گھساتے ہوئے بولا۔ ہانیہ نے ایک نظر اسے

دیکھا۔ پھر سڑک کے کنارے نظریں جماتے ہوئے

پوچھا۔

”آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کیا؟“

ہانیہ کو وہ شخص عجیب سا لگا اور وہ کہنے بنا بھی نہ رہ

سکی۔

”آپ بہت عجیب انسان ہیں۔“

”کچھ نہ کچھ عجیب تو ہر کوئی ہوتا ہے۔ ویسے میں

صرف لگتا ہوں۔“

اس کا لہجہ و انداز متبسم تھا۔ اور وہ یونہی اس کے

ہم قدم اس کی ہر بات کو گویا ٹال رہا تھا۔

”آپ یہیں آس پاس رہتے ہیں۔“ ہانیہ نے

خوبصورت بنگلوں کی طویل قطار کو دیکھا۔

”جی ہاں! آس پاس ہی رہتا ہوں۔“ اس نوجوان کا

لہجہ معنی خیز تھا۔

”ہانیہ احمد کھٹک کر رہ گئی۔ دونوں ہاتھ پشت

پر باندھتے ہوئے اس نے اک سر سری نگاہ ساتھ

کھڑے شخص پر ڈالی۔

”آئی تھنک، اب میں اپنے رستے پر چلنا

چاہتی ہوں۔“

”آپ جانتی ہیں میرا راستہ کون سا ہے۔“

وہ ایک قدم بڑھ کر عین اس کے مقابل کھڑا ہوا کہ

ہانیہ احمد کے لیے اپنے رستے کا عین کرنا مشکل ہو گیا۔

پھر وہ بڑے اعتماد سے بولی تھی۔

”میں اپنا راستہ جانتی ہوں۔“

”او کے۔ پھر ملیں گے۔؟“ اس نے دو قدم پیچھے

ہٹ کر راستہ دیا۔

”یہ ضروری نہیں۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر واپس

پلٹی تھی۔ وہ مسکرایا۔

”یہ ضروری ہے ہانیہ احمد۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا

تھا، ہانیہ اس سرگوشی کو مگر نظر انداز کر گئی تھی۔ اسے

گھر سے نکلے کافی دیر ہو گئی تھی۔ ماما کی خفگی کی بظاہر اسے پروا نہ بھی ہوئی۔ پھر بھی وہ ان کی ناراضی سے خائف رہتی تھی۔ تب ہی گھر لوٹ آئی۔ ماما لان میں خاموش خاموش سی بیٹھی تھیں۔ اس کے جلد لوٹ آنے پر انہوں نے کوئی تبصرو نہیں کیا تھا۔ وہ خود ہی لان چیر گھسٹ کر بیٹھ گئی۔

”عبدال! ایک کپ چائے میرے لیے بھی۔“
عبدال کو پکارتے ہوئے اس نے ماما کے سامنے رکھے ٹھنڈی چائے کے مک کو دیکھا۔ ماما نے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ نجائے ان کی سوچ کی گتیاں کہاں جا کر ابھی ہوئی تھیں۔

”ماما! ہانیہ نے دھیرے سے پکارا۔“
”ہوں۔“ انہوں نے چونک کر ہانیہ کو یوں دیکھا۔
گویا اب اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔
”آگئی تم؟“ انہوں نے اک طویل سانس لے کر چائے کا مک اٹھایا۔

”ٹھنڈی ہو گئی جیسا۔“
”ہاں۔“ انہوں نے آکٹا ہٹ آمیز انداز میں کپ میز پر رکھ دیا۔

”عبدال لا رہا ہے۔“
”ہوں۔“

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“
”کچھ نہیں۔“ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت اس سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔ ہانیہ کے اعصاب کھینچ گئے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔
”عبدال سے کہیے گا چائے میرے کمرے میں دے جائے۔“

”آج احمد کافون آیا تھا۔“
ماما کی آواز پر وہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر تعجب سے ماما کو دیکھا۔
”پاپا کا؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”کیا کہہ رہے تھے؟“ اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا جسے محسوس کر کے عالیہ ایک پل کو خاموش

ہو گئیں۔
”تمہیں اپنے پاس بلارہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب تم کچھ عرصے ان کے پاس رہو۔“

”چھا!“ نجائے کیوں وہ ہستی چلی گئی۔ عالیہ نے ناگواری سے اس کی ہنسی کو سنا تھا مگر یوں کچھ نہیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے خود ہی آنکھوں میں در آنے والے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

”وہ ماما! اب آپ چھوٹے بچوں کی طرح مجھے تقسیم کریں گے۔ کبھی پاپا کے پاس تو کبھی ماما کے پاس۔ کیا زندگی ہوتی ہے یہ ہم جیسے لوگوں کی بھی۔ ٹوٹے پھوٹے بنے ہوئے لوگ۔“

”ہانیہ۔“ عالیہ نے اس کے لہجے میں اترتے کرب کو محسوس کر کے ٹوکا تھا۔
”کچھ نہیں ماما! کبھی کبھی یونہی کچھ عجیب سافیل ہونے لگتا ہے۔ اپنا آپ بہت عجیب سا لگنے لگتا ہے۔ بہر حال۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”اور کیا کہہ رہے تھے ماما؟“

”اور کچھ نہیں کہا اگر تم جانا چاہو تو عبدال چھوڑ آئے گا۔“ ماما نے آنکلی سے کہا۔
”آپ مجھے بھیجتا چاہتی ہیں؟“ ہانیہ نے پوچھا۔

”عالیہ نے چکر اسے دیکھا۔“
”احمد! میں نے کبھی تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا۔ تمہاری مرضی کو ترجیح دی۔ خواہ اس میں میری مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ مگر تمہیں بھی احمد کی طرح میرے کندھے پر ہڈیوں رکھ کر چلانے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔“

”میری تو پر اہم ہے ماما کہ آپ نے کبھی مجھ پر زبردستی نہیں کی۔ کبھی مل ہونے کا حق استعمال نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے مجھے خود سے دور کر دیا ہے جیسے۔ جیسے میں کبھی آپ کے وجود کا حصہ نہیں تھی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گئی۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ لائی ہوں ہانیہ۔“ عالیہ کی آواز بہت تھی۔ ہانیہ ٹھٹھکی سا مسکرائی۔
”آپ مجھے ساتھ نہیں لائیں۔ میں آگئی آپ کے

ساتھ۔ آپ تو شاید مجھے ساتھ لانا ہی نہ چاہتی تھیں۔“ وہ گردن موڑ کر گرتے پتوں کو دیکھنے لگی۔ زرد فضا کی آنکھ میں ٹھٹھکی سی اداسی اتر آئی تھی۔

”میں مجھ سے اتنی بدگمان کیوں ہو ہانیہ! ماں ہوں میں تمہاری۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”آپ کے رویوں نے کیا ہے۔ مجھے ساتھ لا کر بھول گئیں۔ کبھی دیکھا، کبھی پوچھا، ہانیہ کیسی ہے کیا سوچتی ہے کیا چاہتی ہے؟ پاپا کی سیکنڈ میرج نے اس پر کیا اثر ڈالا ہے۔“

”میں اب بڑی ہو گئی ہو ہانیہ۔“
”نہیں ماما! وہ ذرا سا جھٹکی۔ ان کا ہاتھ تھام کر ضبط سے مسکرائی تھی۔ میں اب بھی وہی ہانیہ ہوں۔ اب بھی آپ کی گود میں سر رکھ کر رہنا چاہتی ہوں۔“

اور عالیہ کا دل چاہا وہ اپنی ننھی سی ہانیہ کو اٹھا کر گود میں چھالیں۔ سینے سے لگا کر اپنے سارے بد قسمت رویوں کی تلافی کر دیں اور اس سے قبل کہ ان کے جذلوں پر چھایا خود ساختہ خول ٹوٹ جاتا عبدال ہاتھ میں موبائل لے کر چھٹا تھا۔

”صاحب کافون ہے۔“
عالیہ کے کچھلے جذلوں پر پھر سے برف جم گئی۔ ہانیہ نے اک طویل سانس لے کر موبائل تھام لیا۔
”ہیلو ماما۔“

”ہیلو ماما! چائے! کیسے ہو؟“ دوسری طرف پاپا کے ہمیشہ کی طرح خوش باش، نئی رفاقت کے احساس نے ان کے لہجے کو کچھ اور شگفتہ کر دیا تھا۔

(اور ایسا لیا نہیں تھا ماما میں کہ جس کی کمی آپ کو ڈگر ڈگر بھٹکتی یہاں تک لے گئی)

ہانیہ نے ایک نظر ماما کو دیکھا۔ اترتی شام کی ساری زردیاں ماما کے چہرے پر اتری تھیں۔

(اور نجائے وہ کون سا خوف ہے جو ان ہونٹوں کو مسکراتے نہیں دیتا)

اور دوسری طرف پاپا پوچھ رہے تھے۔
”ہانیہ بیٹا! کب آرہے ہو؟“

”پتا نہیں پاپا! ابھی میں نے سوچا نہیں۔“ وہ

لا پرواہی سے کندھے اچکا کر بولی تھی اور پاپا کے بے حد اصرار کے باوجود وہ انہیں کچھ نہیں سمجھتی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

بہت سے دن یوں ہی نکل گئے۔ نہ وقت بدلات۔ حالات۔ اور نہ ہی موسموں کے تغیر نے مزاج پر کوئی اثر ڈالا۔ وہی ماما کے جذلوں کا اتار چڑھاؤ وہی اجنبیت، وہی ہانیہ کی بدگمانی۔

وہ اس سوال کو سلجھانے میں اب بھی ناکام تھی کہ آخر وہ ماما کے اس رویے کی شکار کیوں ہوئی ہے؟

کیا ماما کے رویے میں یہ تبدیلی محض پاپا کی سیکنڈ میرج کی وجہ سے ہوئی؟

ظاہر ہے ان کا گھر ٹوٹا ہے۔
مگر اس میں ہانیہ احمد کا کیا قصور؟

کیا ہانیہ چاہتی تھی کہ پاپا دوسری شادی کر لیں۔ یا ماما یوں بے گھر ہو کر تنہا زندگی گزارنے لگیں۔

نقصان تو ہانیہ کا بھی ہوا تھا۔

اس کا وجود و نکت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ماما کے ساتھ آئی تھی کہ اسے ماما کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس تھا مگر وہ پاپا کے لیے بے چین رہتی۔

موسم کی ساری بے چینی، ساری بیزاری گویا اس کے مزاج میں رچ بس گئی تھی۔ وہ ماما سے لڑ کر گھر سے نکلی تھی اور اب تنہا اس زرد و سرود شام میں کالونی کی سڑکوں پر بھٹک رہی تھی۔ ہوا کی زد میں آیا تنہا زرد پتہ شاخ سے ہاتھ چھڑا کر اس کے قدموں میں آ پڑا تھا۔ اس کے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔

”کیا فرق ہے مجھ میں اور اس خشک زرد پتے میں؟“

اس نے ذرا سا جھٹک کر پتا اٹھایا۔ حسب عادت وہ اس پتے کو مسل نہ سکے بس ہتھیلی پر رکھے اسے دیکھے گئی۔ سامنے والے بنگلے کے ٹیرس پر کھڑے نو عمر لڑکے نے واٹسن پر اک اداس دھن چھیڑ دی تھی۔ اس نے بیزاری سے پتے کو ہوا کے سر دیا۔

”اور زندگی میں کچھ نہ ہوتا جس قدر ازیت ناک ہے۔“

سنگی بیچ کی ٹھنڈک کو انگلی کی پوروں سے محسوس

کرتے ہوئے اس نے با آواز بلند سوچا تھا۔
”تو آپ خود کو مصروف کیوں نہیں کر لیتیں۔“

وہ عقب سے اس کے سامنے آیا۔ ہانیہ احمد نے سر اٹھا کر قدرے سکون سے سامنے کھڑے اک خوبصورت خواب جیسے شخص کو دیکھا جس کی خوبصورت ڈارک براؤن آنکھوں کا ہر رنگ بڑا سچا اور انمول لگتا تھا۔

”مثلاً کیا کروں؟“ آج وہ اسے دیکھ کر جھجلائی نہیں تھی۔

”کیا آپ کے پاس واقعی کچھ بھی کرنے کو نہیں رہا؟“ خوبصورت آنکھوں کی شفاف سطح پر تیر جاگ۔
”شاید نہیں۔“ ہانیہ کے لیے میں مایوسی در آئی۔
”شاید میرے وجود کا میری ذہانت میری قابلیت کا کوئی مصرف نہیں۔“

وہ قدرے حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر مسکرایا۔
”دوستی کر لیں پھر ہم بتائیں گے آپ کی ذہانت قابلیت کا کیا مصرف ہے۔“
”دوستی! کس سے؟“ ہانیہ احمد نے حیرت سے پوچھا۔

”ہو سکے تو مجھ سے۔“
اور ہانیہ احمد کو اک اچھے اور سچے دوست کی ضرورت تو تھی ہی۔

”لیکن آپ ہیں کون؟“ وہ پھر پوچھے بنانہ رہ سکی۔
”محافظ۔ اس سرزمین کا“ اس کی سرحدوں یہاں کے لوگوں اور۔“

”اور؟“ اس کے جملہ اوجھڑا چھوڑنے پر ہانیہ احمد نے بے اختیار پوچھا۔

”آگے لائن خالی ہے۔ تم چاہو تو پر کرلو۔“ اس نے سہولت سے تکلف کی دیوار گرائی۔ ہانیہ احمد سر جھٹک کر رہ گئی۔ اس نے اجنبی کے اس جملے کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”چھاپھوڑو۔ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ اس نے آفر کی۔ ”شام گہری ہو رہی ہے۔“

”تو! ہانیہ احمد نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”تو ہانیہ احمد، کچھ کام ہمیں اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے کرنے پڑتے ہیں۔“
”دوسرے کون؟“ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کیا کوئی بھی ایسا نہیں جو اس وقت تمہارا انتظار کر رہا ہو۔“

اور ہانیہ احمد نے کھڑے ہوتے ہوئے سوچا۔
ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ماما نے اس کا انتظار نہ کیا ہو۔ کچھ بھی ہو مگر وہ ہمیشہ اس کا انتظار ضرور کرتی تھیں۔

”چلیں۔“ اس نے اتار پڑے ہوئے جوتے پاؤں میں ڈالے۔

”آپ کا گھر؟“
”زیادہ دور نہیں ہے۔“

”ہو بھی تو کیا۔“ وہ کندھے اچکا کر زرب مسکرایا اور ہانیہ احمد نے سوچا تھا کچھ لوگوں پر مسکراہٹ کتنی

سوٹ کرتی ہے۔
”آپ کے گھر میں کون کون ہے؟“ وہ اس کے ہم

قدم تھا۔
”میری ماما۔“

”آپ کے فادر۔“ اس کے لیے میں کوئی تجسس نہ تھا۔ بس پوچھتی وقت گزاری کے لیے یا محض اس سے

مخاطب ہونے کے لیے سوال جواب کر رہا تھا اور ہانیہ کو معلوم بھی نہ ہوا۔ جب تک گھر آیا وہ خود بھی

تکلف کی دیوار گرائے ایک پر غلوں دوستی کی ابتدا کر چکی تھی۔

”آئیے نا۔ میں آپ کو ماما سے ملواتی ہوں۔“ گیٹ کے عین سامنے رکھے ہوئے ہانیہ نے کہا۔ وہ ذرا ساسر

جھٹک کر مسکرایا اور وہ قدم پیچھے ہو گیا۔
”پھر سی۔“

”اوکے۔“ ہانیہ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔
”گلی اتفاقیہ ملاقات تک کے لیے خدا حافظ۔“

اس کی ڈارک براؤن آنکھوں میں ہلکی سی شرارت جاگ تھی۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ ہماری پھر ملاقات ہو۔“ ہانیہ احمد نے نجانے کیوں الجھ کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا بس ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے اک الوداعی مسکراہٹ اس کی نذر کی تھی۔ ہانیہ احمد نے اسے دور تک جاتے دیکھا اور رات کو لا شعوری طور پر اس کو سوچتے ہوئے اس سے پھر ملنے کی خواہش کی تھی۔ مگر وہ اک خوبصورت خواب کی طرح جھٹک دیکھا کر غائب ہو گیا تھا اور پھر بہت سے دن یوں ہی وقت کی گود میں گر کر غائب ہو گئے۔

♥ ♥ ♥
”میں مجھ نہیں پاؤں، ماما مجھے اتنے اصرار سے کہیں بلوار ہے ہیں؟“ گلاس وینڈو سے باہر کن من

کن من ہوئی بارش بارش میں جھپٹتے ہوئے اور جھپٹتے ہوئے کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ انداز میں کہہ

دی تھی۔ فل سائز کافی کے مکے کی گرماش اس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو سکون بخش رہی تھی۔

”پاپا آتش دان کے پاس آکر بیٹھو۔“ ماما کی سپاٹ آواز نرم گرم تاریکی میں بہت جھپٹتے ہوئے۔

ہانیہ چونک گئی۔ نجانے کیوں اسے ماما کی آواز اجنبی

بت اجنبی لگی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آتش دان میں اک لگ رہی تھی اور ماما کی سپاٹ نگاہیں

آتش دان کے عین اوپر لگی فیملی فوٹو میں الجھ رہی تھیں۔ ”ماما! پاپا اور وہ۔“ کتنی مکمل اور خوبصورت فیملی

تھی ان کی۔ اور اب۔ اب جیسے مکمل کچھ بکھر گیا۔ وہ مڑی اور براؤن فالین پر ہلکے پاؤں چلتی ہوئی ان کے

عین سامنے فلور کشن پر آ بیٹھی۔
”ماما! اس نے دھیرے سے ہاتھ ان کے گھٹنے پر

رکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتی ماما نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

وہ شدید رسی رہ گئی۔
”یا خدا! یہ نفرت اور بیزاری کی کون سی منزل آگئی،

میرے اور ماما کے درمیان؟“ عالیہ نے اپنے چہرے پر اس کی سلتی نگاہ محسوس کی مگر یونہی خاموش اور گرم سم

بیٹھی رہیں۔

”ماما! آپ مجھے بس لانا تک کرتی ہیں؟“

ماما کے وجود میں ہلکی سی جھنجھٹ پیدا ہوئی۔ وہ مختصر نگاہیں ان کے چہرے پر گاڑے بیٹھی تھی مگر ان کا جواب اک طویل خاموشی پر محیط ہو گیا تھا۔
”آئی لو یو ماما، آئی لو یو۔“

انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ معصوم نگاہوں میں سوائے محبت و اک حسرت بھری بے یقینی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

”ہانیہ! میری ایک بات مانو گی؟“ ان کے لیے میں ٹھہراؤ تھا مگر ہانیہ ان کے اضطراب کو محسوس کر سکتی تھی۔

”کیس نا۔“

”تم شادی کرلو۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی تھیں۔

”شادی! ہانیہ نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”ہاں تم شادی کرلو۔“

”شادی تو ایک نہ ایک دن مجھے کرنا ہی ہے۔“

”تم رامش سے شادی کرلو۔“ وہ اچانک بولی تھیں۔ ہانیہ نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”ہاں ہانی! تم رامش سے شادی کر لو گی نا؟“ انہوں نے ذرا سا جھٹک کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

جکڑے تھے۔ اس بل نجانے کیوں۔ نجانے کیوں ہانیہ کا دھیان بھٹک کر اک اجنبی محافظ پر جا رہا تھا۔

اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔
”انہوں نے آپ سے بات کی۔“

”نہیں، میرا مطلب ہے۔۔۔“

”نہیں۔“ ہانیہ نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔
”ماما! ایک ایسا شخص جس کے بارے میں میں کچھ بھی

نہیں جانتی۔ آپ خود اس سے کہیں گی کہ ہانیہ احمد سے شادی کرلو، بھلے وہ اس پر راضی ہو یا نہیں۔“

”وہ تم سے شادی کر لے گا ہانیہ! میں کہوں گی تو وہ تم سے شادی کر لے گا۔“ انہوں نے تیزی سے کہا اور

ہانیہ کی آنکھوں میں اندنی تحیر آمیز بے یقینی نے انہیں

احساس دلایا کہ وہ کیا کہہ گئی ہیں اور ہانیہ احمد کا من چاہا کہ وہ جلتے شعلوں کو ہتھیاریوں میں لے کر مسل ڈالے۔ بالکل اس طرح جس طرح ماما نے اس کا دل مسل ڈالا تھا۔ گویا اب ہانیہ احمد اتنی بے وقعت ہو گئی ہے۔

”ہانیہ۔ میں۔“ وہ اضطرابی انداز میں ہاتھ مسلاتے کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔
”آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟“ وہ بمشکل بولی کہ گلے میں پھنسا سارا گیا تھا۔
”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی ہانیہ۔“ وہ بے بسی سے بولیں۔

”ایسا کیوں سوچتی ہیں ماما آپ؟“
”میں تمہیں تمہارے باپ کے پاس نہیں جانے دوں گی ہانیہ۔“

”کیوں ماما! وہ پلایا میں میرے۔“
”اور میں۔ میں کیا ہوں۔ ہانیہ احمد! میری کیا حیثیت ہے تمہاری نظر میں۔ میں جس نے تمہاری خاطر زندگی کے پچیس برس ضائع کیے۔“ وہ چیخ کر بولیں۔

”ضائع کیے۔“ ہانیہ کرب آمیز دکھ کے ساتھ تڑپا خفی تھی۔ ”ماما! میں اولاد ہوں آپ کی۔“
”ہاں تم۔“ عالیہ کچھ کہتے کہتے لب جھنجھکی گئیں۔
”ماما! میری بات سنیں۔“ ہانیہ نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ سلجھتے ہوئے لہجے میں بول اٹھیں۔

”میں جانتی ہوں ہانیہ احمد! اگر تمہیں چوائس دی جائے تو تمہاری چوائس تمہارا باپ ہو گا۔“
”میں نے آپ کو چنا تھا ماما! میں آپ کے ساتھ آئی تھی۔ مگر آپ نے ایک بے بنیاد خوف کے ہاتھوں مجھے ہمیشہ ڈس ہارٹ کیا ہے۔ بولیں ماما! اسے میں آپ کی خود غرضی کموں یا محبت۔ آپ نجانے کس وجہ سے مجھے یوں پیلا سے دور کرنا چاہتی ہیں مگر ایک بات یاد رکھیں ماما۔ پایا کی تمام تر غلطیوں کے باوجود میں ان سے محبت کرتی ہوں۔“

”تو تم رامنش سے شادی نہیں کرو گی۔“ ماما کا لہجہ

ایک دم ساٹ ہوا تھا۔
”ماما! مجھے یوں اپنی نظروں میں مت گرائیں۔“ وہ چیخ کر گئی۔
”مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔“
”آپ مجھے فورس مت کریں ماما۔“

”ہاں یا ناں۔“
”ماما! میری زندگی کا فیصلہ آپ تھا نہیں کر سکتیں۔“ اس کی بات پر ماما کی آنکھوں میں چنگاریاں سی دیکھا خفی تھیں۔
”تو تم انکار کر رہی ہو۔“ ان کا لہجہ ناقابل فہم سا تھا۔

”ماما پلیز!“ وہ جیسے بے بسی سی ہو گئی۔
”ہانیہ احمد! چلی جاؤ یہاں سے۔“ وہ ایک دم چلائی تھیں۔
”آپ پہلے میری بات سنیں۔“ ہانیہ کا لہجہ نجانے کیوں سخت ہو گیا تھا۔

”مجھے سے احمد کے لہجے میں بات مت کرو۔“ وہ چیخ کر گئی۔
”ماما! آپ کیوں بھول جاتی ہیں کہ میرا بھائی ایک لب و لہجہ ہے۔ میں ہانیہ احمد ایک عاقل و بالغ لڑکی ہوں۔ اپنے سارے فیصلے خود کرنے کا پورا حق ہے مجھے۔ آپ یا کوئی اور کوئی بھی مجھ پر زبردستی نہیں کر سکتا۔“ وہ خفیہ کھو بیٹھی۔

اور ماما نے اسے بازو سے دبوچ کر کھڑا کیا تھا۔
”دفع ہو جاؤ ہانیہ! چلی جاؤ اپنے باپ کے پاس۔“
”میں نے آپ کی بات سن لی۔“ وہ لہجے میں میرے پاس کچھ نہیں ہوں کے لیے مت آنا بھی میرے پاس کچھ نہیں ہوں میں تمہاری۔ گیسٹ ہاؤس ہانیہ احمد۔“

وہ باقاعدہ دھکے دے رہی تھیں۔ ہانیہ ان کی حالت پر شدید رسی رہ گئی۔
”ماما۔ ماما! پلیز میری بات سنیں۔“ وہ بے اختیار انہیں پکارنے لگی تھی۔

”تو۔“ ہانیہ! تم فوراً چلی جاؤ یہاں سے۔ آئی بیٹ ہو۔“
اور تب ہانیہ رکی نہیں تھی۔ بھاگتی ہوئی اپنے

کمرے میں جا گئی تھی۔
”میں جانا نہیں چاہتی ماما! مگر میرا چلے جانا زیادہ بہتر ہے۔ شاید آپ مجھے ساتھ لاکر پچھتا رہی ہیں۔“ وہ ایک ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔
”عبدال کو ساتھ لے جاؤ۔“ وہی سپاٹ و اجنبی آواز کمرے کی نیم تاریکی میں ابھری تھی۔
”میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“ وہ کہنے کے بعد کچھ لمحے رکی تھی۔ شاید ماما کچھ کہیں مگر وہی صبح کو گھاسل کرتی خاموشی تھی اور ہانیہ خاموشی سے چلی آئی۔ اس نے پایا کو اطلاع نہیں دی تھی۔

پونہ ایک خیال سا تھا۔ شاید ماما اسے روک لیں۔ پورے چار گھنٹے کا سفر تھا۔ وہ سیدھا ”احمد والا“ آئی تھی۔ وہی چاکلیٹی لائنوں والا سفید خوبصورت گھر جس کے دروازے سے آج بھی اس کا بچپن لپکتا تھا۔ کتنے انمول لمحے اس کی کھڑکیوں دروازوں سے جھانک کر اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

ماما! اور وہ۔
”میں نے آپ کو فون کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر دیا۔“ ہانیہ کا دل بھر آیا۔ گیسٹ کھلا تھا اور چوکیدار غائب۔
عربس لان عبور کر کے وہ اندر چلی آئی، مگر ایک دم سے اجنبیت کے احساس نے گھیر لیا۔ یہ گھر اب کسی اور کی ملکیت تھا اور اس احساس کے ساتھ شاید اس نے پہلی بار سوچا کہ وہ پایا کی دوسری بیوی سے کس طرح ملے گی۔ پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ نجانے کیوں وہ عین اپنے بیدار کمرے کے سامنے رکی تھی۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے دروازہ کھولا اور چپکے سے اندر داخل ہو گئی۔ مگر اسے ٹھٹھک کر رکنا پڑا۔ اس کے قدموں کے نیچے گرین کارپٹ کی جگہ براؤن کارپٹ تھا اور اندر داخل ہوتے ہی جس پینٹنگ پر نظر جاتی تھی وہ بھی غائب تھی۔ تب ہی ہانیہ نے سراٹھا کر کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا تو ایک جھجکا سا لگا تھا۔

یہ اس کا بیدار کمرہ تھا۔
وہ چلی تب ہی اس کی نگاہ کی گرفت میں پھنسا نہیں پر دھری ایک اجنبی نوجوان کی تصویر پر پڑی تھی۔
”ایک سیکورٹی! بھاری مردانہ آواز پر وہ کرنٹ کھا کر بیٹھی۔“

”آپ۔۔۔ آپ کون ہیں؟“ وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔
ایک دم اسے احساس ہوا کہ یہ گھر اب اس کا نہیں۔ اور اسے یوں بلا اجازت اندر داخل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خود ہارون سکندر بلیک جینز اور ریڈ ہائی ٹیک جرسی اور اسکارف میں ملبوس اس پریشان سی لڑکی کو اپنے بیدار کمرے میں اتنی بے تکلفی سے گھراؤ کچھ کر ششدر سا رہ گیا تھا جو اسے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

”میں ہارون سکندر ہوں اور آپ؟“ اس نے سر تاپا ہانیہ کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ پزل سی ہو کر ہتھیلیاں مسلتے لگی۔
”آپ بول سکتی ہیں؟“ اسے یونہی خاموش دیکھ کر ہارون کو کہنا پڑا۔

”میں۔۔۔ میں ہانیہ احمد ہوں اور یہ میرا۔۔۔ میرا گھر ہے۔“
ہارون سکندریوں مسکرایا جیسے کسی بچے کی نادانی پر مسکرایا جاتا ہے۔ وہ اس کی مسکراہٹ پر تاؤ کھا گئی۔
”میں ہانیہ احمد ہوں۔ احمد حسن کی بیٹی اور یہ گھر میرا ہے۔“ اب کے اس کا لہجہ مضبوط مگر قدرے جھنجھالایا ہوا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ ہانیہ احمد ہی ہوں گی۔ مگر سوال یہ ہے۔“ اس نے گیلہا تو لیکہ بند پر اچھالا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر گیلے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ ہانیہ احمد کا عکس ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں منعکس ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ اس کی طرف پلٹا۔

”مگر یہ گھر آپ کا ہے تو میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی اور گہری آنکھوں کی زد میں اس کا پورا وجود تھا۔ ہانیہ اپنا اعتماد کھونے لگی۔ گھر میں چھائی پر اسرار سی خاموشی کا

اور اک اسے شعوری طور پر ہونے لگا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے بلیٹی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

”ہانیہ احمد۔“ وہ اس کے پیچھے نکل آیا تھا۔ ہانیہ پلو کے پاس ذرا کی ذرا رکی۔

”آپ شاید ڈر گئیں۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مگر وہ پزل ضرور تھی۔ پھر وہ بغیر اس کی طرف دیکھے بولی تھی۔

”میں چلتی ہوں۔“

”کہاں؟“

ہانیہ ایک لمحے کو سوچ میں ڈوب گئی۔

”آپ غالباً چیچا وطنی سے یہاں آ رہی ہیں؟“

ہانیہ احمد کا سربے اختیار اثبات میں ہلا تھا۔

”آپ کے فادر نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔“

ہاتھ۔“

”بیچ دیا؟“ ہانیہ احمد نے ایک جھٹکے سے سرائٹا کر

ہارون سکندر کو دکھا۔ اسے یقیناً ”شاک“ لگا تھا۔

ہارون سکندر نے پوری طرح اس کی کیفیت محسوس کی تھی۔

”آپ میں آپ کو آپ کے فادر کا ایڈریس دیتا

ہوں۔“

ہانیہ ایک قدم بھی نہیں بل سکی۔ دماغ ایک دم سن

ہو گیا تھا۔ ہارون سکندر واپس کمرے میں چلا گیا۔ وہ

تب بھی وہیں کھڑی رہی۔ ایک آدھ منٹ کے بعد

واپس آکر اس نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

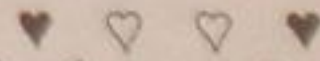
”یہ آپ کے فادر کا ایڈریس ہے۔“

ہانیہ نے یونہی ہاتھ بڑھا کر کارڈ تھام لیا۔

”میں آپ کو ڈراپ کر دوں؟“ ہارون نے اس کی

کیفیت کے پیش نظر آخر کی۔ ہانیہ نے نفی میں سر ہلایا

اور باہر نکل آئی۔



”میں وہ گھر بیچنا نہیں چاہتا تھا مگر بزنس میں اتنا بڑا

نقصان پایا سگار سلگاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہانیہ

نے ایک نظر اپنے گریس فل سے پلایا ڈالی۔

”میں نے تو تب بھی کچھ نہ کہا تھا جب آپ نے

دو سری شادی کی۔“

پاپا خاموش سے ہو گئے۔ ہانیہ پھر سے لان میں کھڑے

پھولوں کو شمار کرنے لگی۔ وہ اس وقت پاپا کے سنے گھر

میں تھی۔ پاپا کی سینڈوائف فارن ٹور پر تھی اور شاید

ان دنوں اسی لیے پاپا اسے اتنے اصرار سے بلا رہے

تھے۔

”تم۔ تم خوش تو ہو ہانیہ۔“

ہانیہ ایک لمحے کو خاموش رہی پھر پوری سچائی سے

بولی تھی۔ ”نہیں۔“

پاپا خاموش ہو گئے۔ ”اور۔ اور عالیہ!“

انگلے سوال پر ہانیہ نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ نظریں

چرا گئے۔

”کیا انہیں خوش ہونا چاہیے۔“ ہانیہ نے انسا سوال

کیا۔

”یہ سب عالیہ کا قصور ہے۔ میں دو سری شادی ہی

تو کر رہا تھا اسے چھوڑ تو نہیں رہا تھا۔ خود بھی چلی گئی اور

تم کو بھی ساتھ لے گئی۔“ پاپا نے ہنسیلا ہٹ آمیز

امیاز میں بکھ جانا والے سگار کو سلا گیا۔

”وہ مجھے ربر دستی نہیں لے گئی تھی۔ میں گئی تھی

ان کے ساتھ کیونکہ ماما بہت اکیلی ہو گئی تھیں اور اس

لمحے انہیں میری زیادہ ضرورت تھی۔“ ہانیہ کا لہجہ

ٹھوس تھا۔ پاپا نے بغور اسے دیکھا پھر پوچھنے لگے۔

”جی بہت زیادہ۔ شاید۔ شاید آپ سے بھی

زیادہ۔ مگر ماما۔ ماما کو مجھ سے محبت نہیں ہے اور جس

طرح انہوں نے مجھے بے وقعت کیا ہے۔“

بے اختیار بات ادھوری چھوڑ کر اس نے لب

بھینچے۔

”کیا۔ کیا کہا تھا عالیہ نے؟“ پاپا بے قرار ہو کر

پوچھنے لگے۔

”کچھ نہیں۔“ ہانیہ ان دونوں کے درمیان مزید

فاصلے پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا پاپا کو یہ

بات اپنی ہی بری لگے گی جتنی کہ ہانیہ کو لگی تھی اور پاپا

بھی جانتے تھے اب ہانیہ انہیں کچھ نہیں بتائے گی۔

”اوجھرتے ہیں۔“ وہ بات بدل گئے۔ لہجہ خاصا اہتمام تھا اور پایا ایک ایک ڈش اس کے سامنے رکھ کر اپنے سابقہ رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لہجہ کے بعد بھی وہ اس کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے اور اصرار کی باتیں کرتے رہے اور وہ ہوں ہوں کرتی چھینل بدلتی رہی۔ اسے پایا کو سننا اچھا لگتا تھا مگر کچھ اجنبیت کا احساس بھی تھا اور جب اگلے دن بھی پایا کی مٹی روٹیں رہی تو وہ کہہ گئی۔

”پاپا! آپ میری وجہ سے خود کو پابند مت کریں۔ میں اپنی دلچسپیاں خود ڈھونڈ لوں گی۔“ اور پایا نے گاڑی کی چابی اس کی طرف کھسادی تھی۔

”انجوائے پور سیلف مائی ڈاٹر۔“ اور اگلے کئی دن اس نے لاہور کی سڑکیں پائی تھیں۔ نہ کسی رشتے دار کے گھر گئی اور نہ کسی فریڈ سے ملی۔ کوئی سربراہ مل بھی جاتا تو یوں نظر انداز کرتی جیسے کبھی ملی ہی نہ ہو۔ یونہی کسی سے بات کرنے کو من ہی نہ کرتا تھا۔

اس دن موسم بہت خوبصورت تھا۔ ہلکی کن من صبح سے جاری تھی جس نے موسم کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ بارش کی تو وہ گرم شال لپیٹتی ملازم کو کافی کا کہہ کر لان میں نکل آئی۔ دھیان بھٹک کر لاما کی طرف چلا گیا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی ماما نے ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا۔

شاید وہ بھی چاہتی تھیں۔ اس نے زور سے سر جھٹک کر اس رخ سوچ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ تب ہی چوکیدار نے گیٹ کھولا تو ایک گاڑی پھسلتی ہوئی اندر چلی آئی۔ ہارون سکندر نے اسے لان میں دیکھا تو سیدھا وہیں چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ادھ کھلے گلابوں کا خوبصورت بوکے تھا۔

”ہیلو۔“
”ہیلو! مگر آپ کی سسز تو۔۔۔“ ہانیہ نے کہنا چاہا۔

”میں ان سے ملنے نہیں آیا۔“ وہ مسکرایا۔
”یاما بھی۔“
”مجھے ان سے بھی نہیں ملنا۔“
”تو۔۔۔“ ہانیہ نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔“ اس نے گلہ زور ہانیہ کی طرف بڑھایا۔
”میرے لیے مگر کیوں؟“
”کیوں؟“ وہ زور سے ہنس دیا۔ ”بڑا عجیب سوال ہے۔“

”بھئی دل چاہ رہا تھا۔“
”مگر میرا دل نہیں چاہ رہا ہے پھول لینے کو۔“
”نیور مائنڈ۔ ڈسٹ بن جانا پھینک دیجئے گا۔ مگر لینے کے بعد۔“ اس کا لہجہ خوبصورت اور متعجب تھا۔

ہانیہ نے گویا مجبوراً ”وہ گلہ سہ تھا ماما تھا۔“
”تھنک یو۔“ اس نے ایک بھر پور نگاہ ہانیہ احمد پر ڈالی جو نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔
”میں اب چلتا ہوں۔“

”بس۔“ وہ حیران سی پھولوں کو دیکھ کر رہ گئی۔ کیا وہ جس اسے پھول دینے آیا تھا۔
”بس۔“ ہارون سکندر نے کہا۔ پھر ہنس دیا، ہانیہ قبل ہی ہو گئی۔

”میں فون کر لوں۔ ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“
”یاما کچھ نہیں بولے خاموش ہی رہے۔“ ہانیہ نے نپیر لیں کیا، دوسری طرف ماما ہی تھیں۔

”یاما۔۔۔“
”ہانیہ! میری جان کہاں چلی گئی ہو تم؟“ وہ گویا رو پڑی تھیں۔
”ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو ریلیکس۔“ قدرتی طور پر وہ تھوڑا سا پریشان ہو گئی تھی۔

”میری بات مان لو ہانیہ، پلیز واپس آ جاؤ۔“
ہانیہ جو ان کے لہجے پر پریشان ہو گئی تھی ان کی اس بات پر بری طرح ہرٹ ہو گئی۔
”ہانیہ! تم نے کیا سوچا ہے، بیٹا! بتاؤ نا۔“
”کچھ سوچنے کے لیے چھوڑا ہے ماما آپ نے۔“ وہ

”اچھا۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔
”آپ ادھر فون کر لیں بابی۔“

”ہاں کر لوں گی۔“
”صاحب ٹھیک ہیں بابی؟“
”ہاں۔“ تم گھر کا خیال رکھنا۔“ ہانیہ نے آہستگی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

”تو ماما! آپ یہ چاہتی تھیں کہ میں درمیان سے نکل جاؤں۔ میں آپ کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکی ماما۔ میں اپنی کھور بھی ہوتی ہے۔ میں تو کبھی یہ بھی نہ جان سکی کہ آپ چاہتی کیا ہیں؟“
”گمانی کے غبار نے دل کے شفاف آئینوں کو دھندلا دیا تھا۔“

”تمہاری ماما کا فون آیا تھا۔“ فون پر پایا نے اسے بتایا۔
”ماما! کب؟“ ہانیہ نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔ پایا نے ایک بل کو اس کی بے تالی محسوس کی پلٹ میں چمکنے کا پس ڈالتے ہوئے بولے تھے۔
”آپ گھر پر نہیں تھیں۔ رات میں رنگ کر لیتا مگر آپ جا رہے تھے۔“

ہانیہ خاموش رہی۔ کچھ دیر پلٹ میں چاؤلوں سے کھانے کے بعد اس سے رہا نہ گیا تو چیخ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔
”میں پہلے فون کر لوں۔ ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“
”یاما کچھ نہیں بولے خاموش ہی رہے۔“ ہانیہ نے نپیر لیں کیا، دوسری طرف ماما ہی تھیں۔

”یاما۔۔۔“
”ہانیہ! میری جان کہاں چلی گئی ہو تم؟“ وہ گویا رو پڑی تھیں۔
”ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو ریلیکس۔“ قدرتی طور پر وہ تھوڑا سا پریشان ہو گئی تھی۔

”میری بات مان لو ہانیہ، پلیز واپس آ جاؤ۔“
ہانیہ جو ان کے لہجے پر پریشان ہو گئی تھی ان کی اس بات پر بری طرح ہرٹ ہو گئی۔
”ہانیہ! تم نے کیا سوچا ہے، بیٹا! بتاؤ نا۔“
”کچھ سوچنے کے لیے چھوڑا ہے ماما آپ نے۔“ وہ

”اچھا۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔
”آپ ادھر فون کر لیں بابی۔“

ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ ”یہ ہی پوچھ لیتیں کہ ہانیہ تم ٹھیک تو ہو۔“
”ہانیہ! میری بات مان لو۔“ وہ ہلکی سی لہجے میں کہہ رہی تھیں۔
”کیوں فورس کر رہی ہیں مجھے۔“

پاپا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جبکہ ماما کہہ رہی تھیں۔
”رامش نے انکار نہیں کیا ہانیہ! وہ تو۔۔۔“
”اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ماما! ہانیہ احمد کے لیے اس سے بہتر پروپوزل تو آئی نہیں سکتا۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولی تھی۔

”ہانیہ! تم یقین کرو وہ لوگ۔۔۔“
”ماما! اس ٹاپک کو بند کر دیں۔“
”ہانی! تم میری بات کیوں نہیں سن رہی ہو؟“
اور ہانیہ نے فون بند کر دیا۔ ماما کوئی اور بات ہی نہیں کر رہی تھیں۔

”سم ٹھنک رائنگ۔“ پایا نے پوری طرح اس کے چہرے پر چھپے تناؤ کو محسوس کیا۔
”پاپا کیوں۔۔۔ کیوں کر رہی ہیں ماما میرے ساتھ اس طرح۔“ وہ ضبط کے آخری مراحل میں تھی۔
”کیا ہوا بیٹے اپنے پاپا کو بتاؤ۔“ پایا کے نرم لہجے پر وہ بکھری گئی۔

”بولیں پاپا! آپ کی بیٹی اتنی بے وقعت و بے حیثیت ہے۔“ سب کچھ بتا کر وہ پوچھنے لگی۔ انہوں نے بے اختیار جھک کر اس کی پیشانی چومی۔
”میری بیٹی بہت انمول ہے۔ کوئی ہے اس جیسا۔ تمہارے لیے تو اتنے بڑے بڑے گھرانوں سے پروپوزل آئے ہیں۔ وہ رامش کیا حیثیت رکھتا ہے۔“
”تو ماما مجھے کیوں فورس کر رہی ہیں پاپا؟“ وہ الجھ گئی تھی۔

”میں جانتا ہوں عالیہ کے دل میں کیا ہے؟“
ہانیہ نے چونک کر پاپا کو دیکھا۔
”وہ تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ تم اس کو مجھ پر ترجیح دیتی ہو۔“

”یاما کچھ نہیں بولے خاموش ہی رہے۔“ ہانیہ نے نپیر لیں کیا، دوسری طرف ماما ہی تھیں۔

ایک اتنا پرست عورت ہے وہ۔ نچا دکھانا چاہتی ہے مجھے۔" پایا زہر خند لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ہانیہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"میری خوف ساما کو آپ کی طرف سے ہے۔"

"بے بنیاد ہے۔ میرا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو تمہیں کبھی اس کے ساتھ نہ جانے دیتا۔" وہ فوراً بولے۔

"میں جانتا تھا کچھ بھی ہو جائے میری بیٹی میرے پاس ہی لوئے گی۔"

"پاپا! آپ اتنی سی بات کیوں تسلیم نہیں کر لیتے کہ میں آپ دونوں کی اولاد ہوں۔ آپ کوئی بھی غلطی کریں ایک دوسرے کو کتنا بھی دس ہارٹ کریں میں آپ دونوں سے محبت کرتی ہوں۔"

"آئی نو مائی ڈائر۔" پایا نے دھیرے سے اس کا گلہ پیچھا کیا۔ "اور ایک بات پر یقین کرو۔ تمہاری ماما تمہیں فوراً نہیں کر سکتیں۔"

پاپا کے پریقین لہجے پر وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

خٹک بادلوں بھری شام کے سائے در و دیوار پر اترے تھے۔ کافی دیر پہلے وہ کافی کامک ہاتھ میں لیے میز پر نکل آئی تھی اور اب آسمان پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

"کتنی بے رنگ اور بے کیف زندگی ہو گئی ہے۔ جیسے جیسے کچھ رہا ہی نہیں۔"

"صرف مجھے والوں کے لیے۔"

ایک مجسم لہجہ اس کی سماعتوں میں گونجا۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ پھر سر جھٹک کر رہ گئی۔

"کچھ لوگ نجانے کیوں پہلی ملاقات میں ہی متاثر کر جاتے ہیں۔"

"ہیلو۔"

ہانیہ چونک کر بلی پھر ہارون سکندر کو سامنے دیکھ کر ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ نجانے کیوں یہ شخص اس کے پیچھے ہی پر گیا تھا۔ اکثر چلا آتا۔ ہانیہ جربز ہو کر رہ جاتی مگر اس کا شرفانہ اور معقول انداز ہانیہ کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھتا تھا اور پھر وہ پایا کی سیکنڈوائف کا

فرسٹ کزن بھی تو تھا۔

"ہیلو!" اس کے ہاتھ میں حسب معمول سرخ گلابوں کا گلہ سہ تھا جو اس نے ہانیہ کی طرف بڑھایا۔

"آپ نے کبھی پوچھا نہیں ہارون سکندر! آپ کے جانے کے بعد میں ان پھولوں کا کیا کرتی ہوں۔" ہانیہ نے گلہ سہ تمام کر پوچھا تھا۔

"جو کچھ بھی ہو وہ ان پھولوں کا نصیب۔" حسب معمول اس نے بات ہی ختم کر دی۔ ہانیہ نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔ پھر پھول سفید میبل پر تقریباً پٹختے تھے۔

"آپ یہ پھول مت لایا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"اوکے۔ نہیں لاؤں گا۔" وہ نجانے کس موڑ میں تھا بہت آرام سے کندھے اچکا کر یوں بولا جیسے کتا سے بات کر رہا ہو۔

"آج کافی نہیں پلو امیں گی۔" ہارون نے اس کے بولنے سے قبل ہی اوہرا دھڑک کر بات بدل دی۔

ملازم لے آئے۔ گلاب "ٹھنڈی کر لیں" دونوں ہاتھوں کا کرہ سر پر جھانکے لگی اور کافی کے آگے اور پیچھے ہونے تک ہانیہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

ہارون سکندر ہی بولتا رہا۔ اپنی دلچسپیاں اپنے شوق و اشتیاق سن کر رہی اور اس بات پر چرتی رہی کہ وہ اسے برا سمجھتے کیوں کرتی ہے۔

"ہارون سکندر! مجھے کچھ جانا ہے۔" بہت دیر کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

"اوکے" اس نے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے اور دھند میں کھلے ادھ کھلے گلاب جیسی لڑکی کو غور دیکھا۔

"سنو ہانیہ! مجھے نہیں معلوم کہ تم میرے بارے میں کیا فینٹکے رکھتی ہو مگر تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

کس آسانی سے کہہ گیا تھا۔ ہانیہ ساکت رہ گئی۔

"تم نے جواب نہیں دیا؟"

"تم یہاں سے بڑے جاؤ۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے

میں بولی تھی۔

"جواب لے رہی تھی۔" اس کا لہجہ "مجھے تم نے کوئی سوال نہیں کیا۔" اس کا لہجہ پلٹ ہو گیا تھا۔

"میں نے سوال کیا ہے ہانیہ احمد۔" وہ ٹلنے والا نہیں تھا۔

"مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا۔"

"کسی سے بھی نہیں" اس امپا بل۔ "وہ حقیر آمیز ہنی ہنسا۔

"تم از کرم سے نہیں۔" ہانیہ کے لہجے میں "ہاں یہ علیحدہ بات ہے۔" وہ ہنس دیا۔ گویا کوئی اثر ہی نہیں ہانیہ نے چکر اسے دیکھا۔

"اوکے۔ اوکے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اس سے قبل کہ تم مجھے دھکے دے کر نکالو، آئی تفنک، مجھے جانا چاہیے۔"

ہانیہ خاموش رہی، مگر اس کے انداز گیٹ لاسٹ ہانیہ تھک رہی تھی۔ ہانیہ سر جھٹک کر اپنے غصے کو نشانہ کرنے کی کوشش کرتے لگی۔

♥ ♥ ♥ ♥

"ہارون سکندر اچھا نوجوان ہے۔"

چند دنوں بعد ہی جب پایا نے نیوز سنتے ہوئے اچانک کہا تو وہ چوکی ضرور مگر کوئی کچھ نہیں۔

"ہانیہ! آپ سن رہی ہو؟"

"ہانیہ! تمہارے خیال میں وہ کیسا شخص ہے؟"

ہانیہ جانتی تھی پایا کیوں پوچھ رہے ہیں۔ تب ہی کچھ زلف کے بعد بولی تو اس کا لہجہ سرسری سا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

"اس نے تمہیں پر پوز کیا ہے۔"

"تو آپ نے کیا جواب دیا۔" اس نے گردن گھما کر رگڑا لگاتے پایا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"جواب مجھے نہیں آپ کو دینا ہے بیٹے۔"

پاپا نے اسے ایک دم سے معتبر کر دیا تھا۔

"کتنے مختلف ٹکڑے پاپا! ماما سے۔" وہ شانت سی ہو کر سوچنے لگی اور پایا کہہ رہے تھے۔

"کچھ دنوں تک اس کے قادر اور مدر انگلیڈ سے واپس آ رہے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ان۔۔۔"

"پاپا! وہ آپ کی سیکنڈوائف کا کزن ہے۔"

"تو؟"

"پاپا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پاپا! ماما۔۔۔ ماما راضی نہیں ہوں گی۔" وہ سر جھٹکا کر ریموٹ کنٹرول سے کھیلنے ہوئے بولی۔

"مگر ہارون سکندر عاصمہ آفندی کا کزن نہ ہوتا تو کیا تمہاری ماما راضی ہو جاتیں؟" انہوں نے اچانک پوچھا اور ہانیہ اچھی طرح جانتی تھی، ماما رامش کے علاوہ کسی اور کے لیے ہرگز راضی نہ ہوں گی۔ تب ہی ایک خیال سا ذہن میں آیا۔

"پاپا کہیں۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پایا ایک پل میں جان گئے وہ کیا سوچ رہی ہے تب ہی سر جھٹکتے ہوئے بولے۔

"تو۔۔۔ نو مائی چائلڈ۔ میں تمہیں ہرگز فورس نہیں کروں گا۔ تم جو بھی فیصلہ کرو، میرے اور اپنی ماما کے دلوں سے بالکل آزاد ہو کر اور یہ سوچ کر کرو کہ زندگی نہیں گزارنی ہے۔ خواہ تمہارا فیصلہ رامش کے حق میں ہو یا ہارون کے۔ تمہارے لیے بہر حال یہ آخری پاپوئل نہیں ہے۔"

پاپا نے فیصلے کا حق اسے دے کر پھر سے انمول کر دیا۔

"میں سوچوں گی پاپا۔"

نہ جانے کس سوچ کے زیر اثر اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ پایا کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

"لیکن آپ ہیں کون؟"

"محافظ اس سر زمین کا۔ اس کی سرحدوں کا" یہاں کے لوگوں اور۔۔۔"

"اور۔۔۔"

"آگے لائن خالی ہے تم چاہو تو پر کر لو۔"

وہ جب بھی کچھ سوچنا چاہتی، براؤن آنکھیں اس

چلی کس طرح گئیں۔ وہ رات کو سوتی نہیں تھیں۔ بار بار یہی کہتی تھیں کہ احمد حسن اب ہانیہ کو کبھی نہیں آنے دے گا اور جب ہم کہتے کہ ہانیہ کو فون کر کے بلوا لیتے ہیں تو صاف انکار کر دیتیں۔ ہمیشہ یہی کہتیں کہ میں دیکھنا چاہتی ہوں میری محبت میں کتنی طاقت ہے۔

”سیمل! ماما کو یہ خوف کیوں ہے کہ بیابا مجھے ان سے ملنے نہیں دیں گے۔“ ہانیہ نے اچانک پوچھا۔ سیمل گڑبڑاسی گئی۔ پھر کندھے اچکا کر بولی۔

”میں کیا جانوں۔ شاید اپنے حالات کی وجہ۔“

”کچھ اور کچھ اور بھی ہے ماما کے دل میں۔“

”مجھے کیا معلوم پھپھو کے دل میں کیا ہے۔ مگر ان کی بلکہ ہم سب کی یہی خواہش تھی کہ ہم ایسی گھر میں خیر چھوڑ دو جو تمہارا اور تمہاری قسمت کا فیصلہ۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

”میرا اور میری قسمت کا فیصلہ۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”یہ نہیں کون سا فیصلہ میرا ہے اور کون سا مطلب؟“ سیمل نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مطلب بھی کیا نہیں۔“ وہ پھکی سی ہنسی ہنس دی۔

”میرے بھائی میں کوئی کمی تو نہ تھی ہانیہ۔“ سیمل نے

چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گئی۔

”جانتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”آؤ چلتے ہیں۔“

تب ہی دائیں طرف کے درختوں کی اوٹ سے سفید گھوڑا اچانک ان کے سامنے آ کر رکا۔ وہ ٹھٹھک کر ٹھہر گئیں۔

”تم لوگ کہاں گھوم رہی ہو؟“ وہ کود کر نیچے اترا اور ان کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہانیہ احمد ششدر سی رہ گئی۔

”یوں ہی گھومنے نکل آئے تھے رامش بھائی۔“

”رامش۔“ حیرت کا اگلا لمحہ اس کی آنکھوں میں

منجمد ہوا۔ تو ڈارک براؤن آنکھیں مسکرا دیں۔

”یہ ہانیہ احمد ہے۔“ سیمل نے تعارف کروایا۔

”کیسی ہو ہانیہ؟“ وہ متبسم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

جبکہ وہ خود ٹکڑ ٹکڑ کر کے دیکھ گئی تھی۔

”رامش بھائی! کیا آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ سیمل نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔

”ہانیہ سے پوچھو۔“ وہ لاپرواہی سے کندھے اچکا گیا۔

”ہانیہ۔“ سیمل اس کی طرف پلٹی تو ہانیہ چونک گئی۔

اس نے اک سلگتی نظر رامش پر ڈالی اور خفگی آمیز لہجے میں بولی۔

”میں کسی کو نہیں جانتی۔“ وہ تلخی سے کہہ کر پلٹ گئی۔

”اس کو کیا ہوا؟“ سیمل نے حیرت سے پوچھا۔

رامش بس کندھے اچکا کر رہ گیا۔

♥ ♥ ♥ ♥ ♥

”خفا ہو؟“ وہ ناشتے کے انتظار میں بیٹھی تھی جب رامش اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”میں نے چاہا کہ اپنا تعارف کروا دوں۔ مگر پھر سوچا گھر میں ملاقات ہو تو جائے گی۔ پھر میں واپس چلا گیا۔“

”بس ٹھیک ہے نا ہماری ملاقات ایسے ہی ہونا تھی۔“ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ شاید ہمت نہیں پاری تھی۔ یا اپنے اندر اچانک جل اٹھنے والے اور اک کے اک ننھے سے دیے سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اس شخص کو اک خوب صورت خواب کی طرح سوچا بہت تھا۔

”مگر میں نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ ہماری ملاقات یوں ہو۔“ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی کے رنگ ابھرے۔

”رامش! آئی ایم ساری۔“ وہ بدقت بولی۔

”نہیں۔ تم نے انکار کر دیا۔ اچھا کیا۔ تمہیں حق

”لما! آئی ایم اے ناٹ چائلڈ“ آپ بیا کے ساتھ نہیں رہنا چاہیں تو اس کی کوئی ریزن تھی۔ اب یہاں سے جاری ہیں تو اس کی کوئی معقول وجہ تو ہوگی۔ اگر تمہارا مقصود تھا تو لاہور والا گھر پر تھا آپ گزشتہ دو سال سے وہاں بیا سے الگ رہ رہی تھیں۔

”وہ گھر تمہارے بیا کا تھا۔“

”سو واٹ بیا کے ساتھ آپ کا رشتہ ختم تو نہیں ہو گیا۔ ان کی ہر چیز پر آپ کا حق ہے۔“ اس نے جرح کی۔

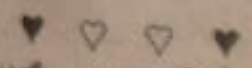
”حق تب تک ہوتا ہے جب تک تسلیم کیا جائے“ وہ مضحل سے لہجے میں بولیں۔

”تسلیم نہ کرنے سے حق ختم نہیں ہو جاتا۔“

”ہانیہ! انہوں نے رنج ہو کر اسے دیکھا“ ختم کرو یہ بحث اور پیکنگ کرو۔“

”جب آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا تو آپ مجھے یونہی ٹال دیتی ہیں۔ یا آپ مجھے اپنا سمجھتی ہی نہیں۔ اس دن بیا کا فون آیا آپ روئی تھیں مگر آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور۔“

”شٹ اپ ہانیہ احمد اینڈ گٹ لاسٹ۔“ وہ نمبر لوڑ کر مینیں ہانیہ کچھ لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔



تیز معصوم چیخ کے ساتھ ہی گاڑی کے پیہیے چرچے ائے تھے۔ مگر گاڑی والا رکا نہیں ہوا ہو گیا۔ ہانیہ احمد کا پاؤں بے اختیار بریک پر پڑ گیا۔ تیزی سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی۔ اوندھے پڑے بچے کو سیدھا کیا۔ دوسرے پل اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بچہ بری طرح زخمی تھا۔ پورا چہرہ بولہمان اور بے ہوش ہانیہ احمد نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر وہ آٹھ دس سال کا صحت مند بچہ تھا اور پھر بے ہوش اس نے مدد کے لیے ارد گرد دیکھا۔ مگر سڑک خالی تھی۔ اکاد کا گاڑی اگر رکی بھی تو بات سننے بغیر بس حادثے کا جائزہ لے کر گزر گئی۔

”یا خدا اتنی بے حسی۔“ اس کے ہاتھوں کی لرزش

حقیقتاً اسے بچے کو سنبھالنے میں ناکام بن رہی تھی۔ بچے کے ماتھے سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ اس نے گٹے سے اس کا رخ سمجھ کر اس کے خون بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پھر اوپر اوپر دیکھا۔ سڑک کے دونوں اطراف میں خوبصورت بنگلوں کا سلسلہ تھا۔ پچہ بیس کہیں سے نکلا ہو گا کہ گاڑی سے ٹکرا گیا۔

”ایک کیو زی“ خیریت تو ہے نا۔“ خوبصورت مردانہ آواز پر وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔

”کیا۔“ خیریت نظر آ رہی ہے آپ کو؟“

”میرا مطلب ہے شاید آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔“ ساتھ ہی اس نے بچوں کے بل بٹھ کر بچے کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

”مجھے یقیناً“ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ پلیز اسے اٹھا کر میری گاڑی میں ڈال دیں۔“ وہ ملتی لہجے میں بولی۔

”سے آپ خود کو سنبھالیں۔ بچہ زیادہ زخمی نہیں ہے۔“ ہانیہ کو اس قدر ہراساں دیکھ کر اسے تسلی دینا پڑا۔

”زیادہ زخمی نہیں ہے۔ اتنا خون بہہ رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں۔“

”اچھا شانی پر ہلکا سا زخم ہے۔“ وہ بچے کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

”بے ہوش تو وہ خوقہ ہوا ہے۔“ ہانیہ چڑ کر بولی۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”بچہ تھا۔ خوفزدہ ہو گیا۔“ اس نے بچے کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے لٹاتے ہوئے کہا۔ ہانیہ نے جل کر اس کی پشت کو گھورا اور بریڈائی۔

”خود کے لگی ہوئی تو دیکھتی۔“

”آپ مینیں اس کے پاس میں ڈرائیونگ کرتا ہوں ورنہ دوسرا ایکسیڈنٹ یقینی ہے۔“ ہانیہ خاموشی سے لپک کر پیچھے آئی اور بچے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ گاڑی ایک نزدیک ترین چھوٹے سے کلینک کے سامنے جا کھڑی تو وہ پھر سے جھنجھلائی۔

”کسی اسپتال میں چلے“ اسے خون کی ضرورت پڑ

کتی ہے۔“

”آپ خاموشی سے میرے ساتھ چلیں۔“

اس نے بچے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ہانیہ کو مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے بینڈج اور ڈھیر ساری تسلی کے بعد انہیں فارغ کیا تھا۔ پچہ بھی ہوش میں آ گیا۔

”بس اتنی سی بات تھی۔“ ہانیہ کی گویا جان میں جان آئی۔

”جی ہاں بس اتنی سی بات تھی۔“ اس نے بظاہر سرسری نگاہ تراؤزر شرٹ میں ملبوس اس منفرد سی لڑکی کو دیکھا جو دونوں ہاتھ بچے کے کندھے پر رکھے اب ٹھہرتی نظر آ رہی تھی۔

”آپ چلیں علی۔“ اس نے جھپٹ کر علی سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”میں۔“

ہانیہ احمد نے پہلی بار اپنے مددگار کو غور سے دیکھا۔

لباؤ، مضبوط جسامت اور بے حد خوبصورت گہری آنکھیں۔ لائٹ کریں۔ شرٹ، ملک، سینٹ، قومی بھارت۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”سامنے والے ڈارک براؤن آنکھیں چمک اٹھیں۔“

”اس ملک کی سرحدوں کا محافظ ہوں۔“

”اوہ! آرمی میں ہیں آپ!“

”جی ہاں۔ آرمی میں کیپٹن ہوں۔“

”کیپٹن رامش منظور۔“

”کیپٹن رامش۔۔۔“ وہ بے اختیار چونکا۔ ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور مسکرا دیا۔

”جی ہاں۔ وہ میرا بہترین دوست ہے۔ ہماری پوسٹنگ ایک ساتھ ہوئی تھی۔“

”آئی سی! آج کل وہ لاہور میں ہوتے ہیں۔“ ہانیہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے چھوٹے چھوٹے بالوں کو انگلی کی مدد سے پیچھے ہٹایا۔

”جاننا ہوں۔“

”میں اب چلتی ہوں۔ علی کے گھر والے بھی پریشان ہوں گے۔“ ہانیہ نے علی کا ہاتھ تھاما۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“ اس نے پلٹتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ہانیہ احمد۔“

عنائی لیوں پر مبہم مسکان گہری ہو گئی۔

”اور آپ کا نام؟“

”آپ مجھے محافظ کہہ لیں۔“ وہ خوبصورتی سے ٹال گیا۔

”کہہ لوں!“ ہانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر قدرے خفگی سے بولی۔

”گویا آپ بتانا نہیں چاہتے۔“

جواب اک مسکراہٹ تھا۔

ہانیہ نے چڑ کر علی کا بازو تھاما اور اسے بغیر لفٹ کی پیشکش کیے اپنی گاڑی کی طرف آگئی۔ علی سے اس کے گھر کا پتا پوچھ کر اسے چھوڑنے لگی تو سونج کا سفر اختتام پذیر ہونے کو تھا۔ وہاں وہی حال تھا جو بچے کی گمشدگی کے بعد کسی بھی والدین کا ہو سکتا تھا۔

احساس تشکر سے چور علی کے ممی ڈیڈی نے اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود چائے پیسے بغیر نہیں آنے دیا۔ وہ واپس لوٹی تو دن کے اچالے میں رات کی سیاہی کے چھینے بڑھکے تھے۔ ممالاؤنج میں بیوی کھولے کوئی ڈاکو منڑی فلم دیکھ رہی تھیں۔

”یہ کون سا وقت ہے گھر لوٹنے کا۔“ وہ چھوٹے ہی بولیں۔ ہانیہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”میں لاہور میں اس سے زیادہ دیر سے گھر آیا کرتی تھی ہرما۔“

”وہ لاہور تھا اور یہ بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں مارکیٹ نکل جاؤ تو ہر کوئی پہچان لیتا ہے کہ یہ لوگ کون ہیں۔“

”آئی ڈونٹ کیئر۔“

”ہاں تمہیں تو اب میری پروا بھی نہیں رہی۔“

انہوں نے شکوہ کیا۔ ہانیہ نے خیر سے انہیں دیکھا پھر لب بچھینچ کر اوپر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ نجانے ان کا

حاصل ہے۔ مگر میں سمجھوں گا کہ میرے جذباتوں میں کھوٹ تھا۔ کیس کوئی کمی تھی میری دعاؤں میں۔ اس کے گھمبیر لہجے پر ہانیہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اک احساس زبیاں نے اس کے دل کا گھیراؤ کیا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے ست دھیان سے سنا۔ رامش نے ایک بل کو اسے دیکھا۔ پھر میز پر ہتھلی کا دباؤ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

”تم چلی جاؤ گی تو میں بہم سب تمہیں یاد دہشت کریں گے۔“ وہ کہہ کر چلا گیا تھا اور ہانیہ ساکت رہ گئی۔ ”اور مجھے یوں ہی تو احساس نہ ہوتا تھا کہ کیس کوئی کی کوئی غلطی ہو رہی ہے۔“ میز کی ٹھنڈی سطح پر پیشانی ٹکاتے ہوئے اس نے گویا تھک کر سوچا تھا۔

”تمہارے پیلا آئے ہیں ہانیہ۔“ سیمل نے آکر اطلاع دی۔ وہ جو شیراز کی اوٹ ٹانگ باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کر رہی تھی چونک گئی۔

”کہاں ہیں۔“ ”لاؤنج میں۔“ سیمل کچھ سنجیدہ سی نظر آئی۔ ”اور ملا۔“ وہ اٹھتے اٹھتے پوچھنے لگی۔ ”وہ بھی وہیں ہیں۔“ سیمل نے شیراز کو دیکھا۔ ”تم چلو میں چائے بھجواتی ہوں۔“ اور ساتھ ہی شیراز کو اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ ہانیہ سر ہلا کر لاؤنج کی طرف آگئی۔

”اب تم کیا کہتی ہو عالیہ! وہ میری بیٹی تھی اس کا فیصلہ میرے حق میں ہی ہوا۔ ثابت ہو گیا کہ خون کی کشش کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ تم نے لاکھ جتن کیے مگر تمہارے گھٹنے۔ کیونکہ ہارنا تو تمہیں ہی تھا۔“ پیلا کے لہجہ و الفاظ میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ ہنسنے لگا۔

”میں نے تو ہار جیت کا کوئی کھیل نہیں کھیلا تھا احمد حسن! تم نے نجانے کیوں انا کا مسئلہ بنا لیا۔“ ماما کی آواز سے تھکن مترشح تھی۔

”تم نے مجھ سے میری بیٹی چھیننے کی سازش کی تھی عالیہ بیگم۔“ ”میں نے تم سے اپنی بیٹی مانگی تھی احمد حسن! بھکاری کی طرح جو امن پھیلایا تھا تمہارے سامنے۔“ ہانیہ نے دروازہ ذرا سا کھول دیا۔ آواز اب واضح طور پر آنے لگی تھی پیلا کہہ رہے تھے۔ ”تم یہ حقیقت تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں عالیہ کہ ہانیہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ تم نے محض اسے پیلا ہے۔“ پیلا کی سفاک آواز نے تیز دھار تلوار کی طرح ہانیہ کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ بے یقینی کی بنا پر یقینی تھی وہ گویا خلا میں معلق ہو گئی۔ ”جب میں تمہارے گھر میں بن کر آئی۔ تو مجھے پہلے دن ہی احساس ہوا گیا تھا۔ میں ان چاہی ہستی ہوں۔ مجھے صرف ہانیہ کے لیے لایا گیا ہے۔ میں چاہتی تو اس کے گول پھول سے وجود کو نفرت کی آگ میں جلا کر رکھ کر رکھ دیتی۔ مگر احمد حسن میں نے ہانیہ کے وجود کو اپنی ہتھیلیوں میں دعا کی طرح سنبھالا تھا۔ تم مجھے بھول گئے۔ کبھی دیکھا ہی نہیں کہ تمہارے گھر میں جنہوں اور انہوں سے معمور دل لیے اک بیوی موجود ہے۔ مگر میں ہانیہ کو کبھی نہیں بھولی۔ اس کے وجود میں میرا سکون تھا۔ چاہتی تو سب کچھ چھوڑ کر لوٹ آتی مگر میں ہانیہ کی جان بن گئی۔ اک عمر گزار دی اس گمان میں کہ میری کوئی بیٹی ہوگی تو وہ ہانیہ جیسی ہی ہوتی۔ تو پھر ہانیہ کیوں نہیں پاگل ہو گئی تھی اس کی محبت میں۔ ماما کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ”وہ بڑے بڑے ہونے لگی۔“ ”کہہ رہی تھیں۔ ہانیہ کو معلوم بھی نہ ہوا وہ کب روئے گی۔“

”تم نے دوسری شادی کی اجازت مانگی احمد حسن! تو میں نے روکا نہیں۔ میں نے کہا مجھے ہانیہ دے دو۔ میں اسے یہاں لے آئی۔ مگر میں نے اپنی بیٹی کو بہت دکھ دیے۔ اسی خوف کے زیر اثر بھی اسے پیار بھی نہ کر سکی کہ تم اسے لے جاؤ گے۔ جب تم نے فون پر مجھے ہارون کے پرنسپل کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی تم اصرار کے ساتھ اسے بلانے لگے تو میں ڈر گئی۔“

”خوف نہ ہو گئی۔ میرے پاس تھا ہی کیا ہانیہ کے سوا۔ مگر کچھ سوچا ہی نہیں اور جلد بازی میں ہانیہ کو خود سے لے کر اس گھر سے بد ظن کر بیٹھی۔“ ”پیلا نے کیم کھیلا۔“ وہ ”تو ہارون کا پرنسپل۔“ ”اعتراف ہانیہ کو ہلا گیا۔“ ”تم نے کہا عالیہ اگر میری بیٹی تمہارے ساتھ رہے گی تو تم اپنے بھائی کے گھر نہیں رہو گی۔ میں نے ہانیہ کے لیے علیحدہ گھر بھی لے لیا تھا۔ مگر اب اب احساس ہو رہا ہے وہ تمہاری بیٹی تھی اور میں میں نے آندہ جیوں میں چراغ جلانے کی کوشش کی تھی۔“ ”انجام تو یہی ہونا تھا۔“ ”وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔“ ”جاؤ احمد حسن! میں نے ہانیہ تمہیں سونپ دی۔“ ”میں نے سونپ دی کہ مجھے آج بھی اس کی ہمت سب سے زیادہ عزیز ہے۔“

”ماما! وہ چونک کر پلٹیں۔ پھر ضبط سے ”ہوں۔“ ”جا رہی ہو؟“ ”مکراہیں۔“ ”ہانیہ خاموشی سے کھڑی رہی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما۔ پھر ان کے لبوں نے اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلی بار ہانیہ کو اپنی گود میں لیتے تھے۔“ ”خدا ہمیں ہمیشہ خوش رکھے۔“ ”ماما! اسی آف کرنے دروازے تک نہیں آئیں گی۔“ ”ہانیہ نے کہا تو وہ بڑے ضبط سے مسکرائیں۔“ ”ہاں کیوں نہیں۔“ ”تو چلیں۔“ ”ہانیہ نے ننھی پچی کی طرح ان کا ہاتھ تھام لیا۔ لاؤنج میں سب ہی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اک سکوت سا طاری تھا۔

”چلیں ہانیہ۔“ پیلا گویا اسی کے انتظار میں تھے۔ ماما کے لبوں سے سسکی سی نکلی۔

”پیلا! ہانیہ نے ایک نظر سب کو دیکھا پھر احمد حسن کے سامنے آئی تھی۔“ ”میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔“ ”ہانیہ!“

”میں ماما کے ساتھ رہوں گی ہمیشہ اور میں وہیں شادی کروں گی، جہاں ماما چاہیں گی۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا اور پھر رکی نہیں ان سب کو ہکا بکا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”ہانیہ! ہانیہ تم نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“ شیراز اور سیمل فوراً اس کے پیچھے آئے تھے۔ ”اس میں سوچنے سمجھنے والی کیا بات ہے۔ ماما کی ریاضتوں کا کچھ تو صلہ ہو۔ وہ بہت محکم ہیں سیمل اور میں۔ میں بہت بری ہوں۔ میں نے انہیں بہت دکھ دیے ہیں۔“ وہ رورہی تھی۔

”آپ بہت اچھی ہیں ہانیہ! یقین کر لیں کیونکہ ہم کہہ رہے ہیں۔“ شیراز نے تسلی دی تھی۔ تب ہی ماما چلی آئیں۔ اک شادی مرگ کی سی کیفیت تھی پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ اسے گلے سے لگا کر رو پڑیں۔ مگر ان آنسوؤں میں خوشی کا رنگ غالب تھا۔

”تم نے تو مجھے مالا مال کر دیا ہانیہ۔“ ”آپ نے مجھے معاف تو کر دیا ماما۔“

”معافی کس بات کی؟“ انہوں نے ہتھیلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”میں نے آپ کو بہت غلط سمجھا تھا ماما۔“ ”تو اب تلافی بھی تو کر دی۔“

سیمل نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو علیحدہ کیا۔ تو وہ دونوں آنسوؤں میں مسکرا دیں۔

UrduPhoto.com